نگار

نیاز فتحپوری

قواعد رسالۂ نگار

۱ - رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے
۲ - رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا
۳ - خط وکتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جسپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضایع کردیے جاتے ہین
۴ - جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ارکا ٹکٹ آنا ضروری ہے
۵ - مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئین -
۶ - سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ - بیرون ہندوستان روپیہ سالانہ -

نگار

نرخنامہ اجرت اشتہارات

(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دین گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدلسکتا ہے

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۲۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے — جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

مرزا غالب

اردوے معلی ۲ حصے
عود ہندی ۲ حصے
دیوان جیبی ۲ حصے
مکمل دیوان ۲ حصے

مولانا نذیر احمد

محاکمہ مترجم ۲ حصے
الحقوق والفرائض ۲ حصے

نبات النعش ۹ر
مراۃ العروس ۱۰ر
توبۃ النصوح ۱۲ر
موعظہ حسنہ ۲ حصے
رویاے صادقہ ۲ حصے
ایامیٰ ۲ حصے
فسانہ مبتلا ۲ حصے
ابن الوقت ۲ حصے
مصائب غدر ۱۲ر

مولانا شبلی

سیرۃ النبی جلد اول مع ۲ حصے
" دوم ۲ حصے
" سوم ۲ حصے
الفاروق ۲ حصے
سیرۃ النعمان ۲ حصے
الغزالی ۲ حصے
المامون ۲ حصے
سوانح مولانا روم ۲ حصے

سفرنامہ مصر وشام ۲ حصے
علم الکلام ۲ حصے
الکلام ۲ حصے
رسائل شبلی ۲ حصے
مقالات شبلی ۲ حصے
شعر العجم جلد اول ۲ حصے
" دوم ۲ حصے
" سوم ۲ حصے
" چہارم ۲ حصے
" پنجم ۲ حصے

موازنہ انیس و دبیر ۲ حصے
مضامین عالمگیر ۸ر
آغاز اسلام ۸ر
کلیات فارسی ۲ حصے
کلام شبلی اردو ۸ر

امیر مینائی

امیر اللغات ۲ حصے
صنمخانہ عشق ۲ حصے
مراۃ الغیب ۲ حصے

محامد خاتم النبیین ۸ر
ضیاے سخن ۲ حصے
مکاتیب امیر مینائی ۲ حصے

رتن ناتھ سرشار

فسانہ آزاد ۲ حصے
سیر کہسار ۲ حصے
خدائی فوجدار ۲ حصے
جام سرشار ۲ حصے
الف لیلیٰ بطرز ناول ۲ حصے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴ جلد ۱۳ - شمار ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ کو شایع ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول ڈاک

فہرست مضامین سنہ ۱۹۲۸ء

ملاحظات	نیاز فتحپوری	۲
سلطان محمود غزنوی	غلام محی الدین قادری ام اے	۵
افسانۂ اردو	محمد عباس اقدس	۱۶
پریم کی چوڑیاں (فسانہ) ...	ڈاکٹر اعظم کریوی	۳۱
غائب بے نقاب	"آرگس"	۴۱
چنگاری (فسانہ)	نیاز فتحپوری	۶۰
لارڈ رپن کا عہد حکومت	ض - ا - ب - بی اے	۶۷
مثنوی زہر عشق کیونکر وجود میں آئی	احسن لکھنوی	۷۳
میری ڈائری کا ایک ورق ...	نیاز فتحپوری	۷۶
لکھنؤ کی صحیح رنگ کی شاعری	نیاز فتحپوری	۸۱
استفسارات	نیاز فتحپوری	۸۷
چند روز لکھنؤ میں (نظم)	اختر شیرانی	۹۱
عہد گزشتہ کی یاد (نظم)	نظیر لودھیانوی	۹۲
غزلیات :—	آزاد انصاری، اثر لکھنوی	۹۳
"	اثر رامپوری، اکبر حیدری	
"	امین سلونوی، ثاقب جالندھری	
"	راز رامپوری، شوق مرادآبادی	
"	فرخ بنارسی	۹۶

علوی پرنٹنگ ورکس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۳) | فروری سنہ ۱۹۲۸ء | شمار (۲)

ملاحظات

گزشتہ ماہ کے رسالہ نے جہاں "گوش سخن شنو" اور "دیدۂ اعتبار" کی کیفیتیں دکھیں، وہیں بعض کی "چین پیشانی" کا بھی منظر سامنے آیا۔ اُس پر بجائے شکریہ کے مجھے صرف اظہار مسرت کرنا ہے اور اس کو یہ کہکر ختم کر دینا کہ "سخن شناس نۂ دلبرا"۔ بہرحال مجھے ہنوز یہی حجاب دامنگیر ہے کہ مومن کی شاعری کے متعلق اب تک اپنے حوصلہ کے مطابق کچھ نہیں کر سکا۔

خیال تھا کہ مومن کے متعلق بعض وہ مضامین جو جگہ کی کمی کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکے فروری میں درج کر دئے جائیں گے لیکن میں نے یہ خیال ترک کر دیا، کیونکہ بار بار ایک ہی موضوع کی تکرار بھی بے لطف سی بات ہے۔ بعض وہ حضرات جو جنوری کے رسالے سے خائف ہو گئے ہیں اُمید ہے کہ اب یہ سنکر مطمئن ہو جائیں گے۔

اس مہینے کے مضامین میں ہمارے عزیز دوست جناب زور ام اے کا مضمون سلطان محمود غزنوی کے علم و فضل اور اس کی علم پرستیوں کے متعلق بہت دلچسپ و پر از معلومات ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے بعض ایسے مسائل پر بھی مخالف روشنی پڑتی ہے، جو اس وقت تک حقائق مسلمہ میں داخل تھے۔

جناب زور اس وقت دلایت میں تحقیق لسانیات کے لئے مقیم ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ بہت جلد ملک اُن کے اکتسابات علمیہ سے فائدہ اُٹھائے گا۔

دوسرا مضمون "افسانۂ اردو" جناب اقدس حیدرآبادی کا ہے جس میں دکن کے ایک پُرانے شاعر عاجز کا تذکرہ اور انکا کلام پیش کیا گیا ہے مجھے اس سے اختلاف ہے کہ عاجز اگر میر کے ہمعصر ہوتے تو اُن کے ہمصفیر بھی تھے۔ عاجز کو میر کے رنگ کلام سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

تاہم جناب اقدس حیدرآبادی کے ہم ممنون ہیں کہ اُن کے ذریعہ سے اردو کے ایک ایسے شاعر کے حالات اور اشعار شائع ہوسکے جن سے لوگ بہت کم یا بالکل آگاہ نہ تھے۔

اس مضمون کا عنوان "افسانۂ اردو" اسی وقت موزوں ہوسکتا ہے جب ایک سے زاید ایسے قدیم اور نامعلوم شاعروں کے حالات اسی سلسلہ میں شائع ہوجائیں — ہمیں یقین ہے کہ جناب اقدس اس عنوان کے صحیح مفہوم سے باخبر ہوں گے۔

تیسرا مضمون "پریم کی چوڑیاں" جناب اعظم کریوی کا افسانہ ہے اور اس قدر لطیف و پُراثر ہے کہ اُس کو پڑھکر دیر تک مجھ پر کیفیت طاری رہی۔ گانوں کی معاشرت کو پیش نظر رکھ کر فسانہ لکھنا آسان نہیں، اور اس سے وہی شخص عہدہ برآ ہوسکتا ہے جو نہ صرف دہان کی زندگی سے آشنا، بلکہ اس زندگی کی صحیح روح اور معصوم کیفیات سے بھی باخبر ہو۔ میں جناب اعظم کریوی کو مشورہ دونگا کہ چونکہ وہ اس مخصوص موضوع پر دسانے لکھنے کی بہت کچھ اہمیت اپنے اندر رکھتے ہیں اسلئے انھیں اسی میں کماں بہم پہونچانے کی سعی کرنی چاہیے

"غالب بے نقاب" وہی موعودہ مضمون ہے جس کا ذکر جنوری کے رسالہ میں کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ بھی جناب قبلہ آرگس کا ہے جو اس سے قبل حافظ اور ابن یمین کے متعلق آتش افشانی کرکے اپنے کو بجا اور مجھے بالکل بیجا طور پر زمانہ کا نشانۂ ملامت بنا چکے ہیں۔

مانا کہ جناب "آرگس" آرگس ہی کی طرح ہزار چشم سہی لیکن یہ کیا تماشا ہے کہ اُن کی ہزار آنکھوں میں سے ایک نگاہ بھی "صلح جو" نہیں نکلتی۔ اس میں کلام نہیں کہ انھوں نے اس مضمون میں بہت کچھ اپنا سرمایۂ تحقیق سامنے رکھدیا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ غالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو اساتذۂ قدیم کے خیالات سے متاثر ہونے کے بعد لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، مگر یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ غالب باوجود اس "کشف حجاب" کے بھی غالب ہے اور اس کے شاعرانہ ابداعات اپنی جگہ بالکل عنصر غیر فانی کی حیثیت رکھتے ہیں مجھے اکثر جگہ جناب آرگس سے اختلاف ہے۔ اگر یہ بحث لطیف چھڑ گئی تو اس وقت تفصیل کے ساتھ عرض کرونگا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ بعض حضرات اس مضمون کو بھی "حافظ اور ابن یمین" کے مضمون کی طرح میری ہی طرف منسوب نہ کردیں۔

مثنوی زہر عشق کی وجہ تصنیف کے متعلق جناب احسن لکھنوی کا مضمون ایک ایسا انکشاف ہے جو اس سے قبل بالکل تاریکی میں تھا ہم جناب احسن کے ممنون ہیں کہ انھوں نے تاریخ ادب کے ایک مختصر مگر ضروری واقعہ سے آگاہ کردیا۔

میرے مضامین میں چنگاری ایک افسانہ ہے جس کے افراد کا اس نمبر میں تعارف کرایا گیا ہے، میں ابھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ آئندہ اشاعت میں ختم ہوجائیگا یا نہیں، کیونکہ جس خیال کو پیش نظر رکھ کر اس کی بنیاد ڈالی گئی ہے وہ تدریجی وضاحت چاہتا ہے اور ممکن ہے کہ وہ اس کو دو نمبروں تک کھینچکر لیجائے۔ ڈائری کا ورق بھی گویا ایک افسانہ ہی کا حصہ ہے جس کے باقی حصے آئندہ نمبروں میں شائع ہوکر ایک مکمل فسانہ کی صورت اختیار کریں گے۔

استفسارات کے سلسلہ میں اس مرتبہ حضرت یوسفؑ کے حسن و جمال پر بحث کی گئی ہے۔ اگر کوئی صاحب میرے دعوے کے خلاف کلام مجید سے حسن یوسفی کو ثابت کردیں گے "تو دنیائے شعر و ادب" کی بڑی خدمت انجام دیں گے، مجھ سے تو یہ خدمت ادا نہیں ہوسکتی۔

جاوید مرحوم کی شاعری کے متعلق سلسلۂ کلام میں لکھنؤ اور دہلی کے رنگ شاعری پر بھی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ پڑ گئی ہے۔ کیونکہ یہ بحث خواہ کتنی ہی پارینہ کیوں نہ ہو، اس وقت تک نہیں مٹ سکتی جب تک دنیا میں حقیقت و مجاز کا مسئلہ زندہ ہے۔

جناب اختر شیرانی اس دوران میں لکھنؤ آئے اور مجھے بھی انھوں نے کافی ستایا۔ اُن کی نظم لکھنؤ کی اُس فضا کی یاد میں ہے جہاں کی راتوں میں اب بھی بہت سے کبھی نہ طلوع ہوسکنے والے "چاند" جگمگایا کرتے ہیں، گو میرا تعلق ان سے ایسا ہی بعید کیوں نہ ہو جیسا جناب اختر کا تعلق اُس "حسن نازنیں" سے جس کی خلش کو وہ "یادگار لکھنؤ" سمجھتے ہیں۔ خدا کرے یہ سب "جوانی" کا جھوٹ ہو

مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے اپنی غزل اب سے پچاس سال قبل پیچھے ہٹ کر کہی ہے اور وہ بھی دہلی کی سرزمین میں ساری غزل ایک رنگ و کیفیت کی ہے اور مرزا صاحب کے میر پرستی کا عملی ثبوت۔ اور حضرات کی غزلیں بھی اچھی ہیں اور بعض بعض شعر تو نہایت پاکیزہ ہیں۔ جن احباب کی نظمیں یا غزلیں ابھی تک شائع نہیں ہوئیں وہ آئندہ رسالہ کا انتظار فرمائیں۔

آئندہ مادے سے ایک سلسلہ نہایت ہی مفید و لطیف ظریف شعراء کے تذکرہ کا شروع کیا جائے گا جو بعد کو مستقل کتابی صورت میں شائع ہوگا۔ بعض اور اہم مضامین بھی زیر ترتیب ہیں

بعض احباب کے شدید اصرار پر اڈیٹر کی تصویر ماہ آئندہ کے رسالہ میں شائع کی جائے گی۔

نیاز فتحپوری

سلطان محمود غزنوی اور علم و فضل

سلطان محمود غزنوی کی ہستی کے متعلق اب تک متفرق غلط فہمیاں باقی ہیں، اس کی زندگی کا سیاسی پہلو متعدد شکایتوں کا آماجگاہ بنا رہا اور اسی لحاظ سے اس کی شخصیت مختلف النوع تعصبات کے لئے تختۂ مشق کا کام دیتی رہی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ جہاں اُس کی سیاسی کارگزاریوں کی تحقیق و تفتیش میں خاص طور پر سرگرمی دکھائی جاتی ہے، علمی خدمات کی طرف بہت کم کوئی توجہ کرتا ہے۔ اُس کی سب سے بڑی وجہ تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ محمود کو صرف ایک ثروت پسند اور جنگجو فرمانروا تصور کر لیا گیا ہے اور اس لئے اس سے علمی و ادبی قدر دانی کی امید رکھنا اس کی شخصیت کے ساتھ ناانصافی کرنا خیال کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ اس کی ذات پر بہت بڑا ظلم ہے۔ محمود نہ صرف ایک ثروت پسند اور آزادہ رو بادشاہ تھا جیسا کہ عام طور پر اُس کو قرار دیا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُس نے دل بہلانے اور تعریف کے خاطر عالموں، فاضلوں اور شاعروں کی قدر کی بلکہ وہ خود بھی ایک پایہ کا شاعر اور بلند مرتبہ عالم تھا۔ اس نے اپنے زمانہ کے بڑے بڑے علما اور کاملین فن سے علوم شرعیہ کی تحصیل کی تھی۔ علامہ ابی الوفا القریشی المتوفی ۷۷۵ھ نے اسے ائمۂ فقہا میں شمار کیا ہے۔ حدیث و فقہ میں اُس نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک "کتاب التفرید" نہایت مشہور ہے اور فقہ احناف کی کتب مستندہ میں شمار ہوئی ہے۔ اس میں ساٹھ ہزار مسائل مذکور ہیں

محمود عربی و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتا تھا۔ موشیو نے اپنی کتاب "منتخبات فارسی" (دیکھو کرسٹائی دبیر سان جلد دوم صفحہ ۲۵) میں "محمود نامہ" کو سلطان محمود غزنوی ہی سے منسوب کیا ہے۔ اگرچہ یہ غلط ہے لیکن محمود کے متفرق اشعار اب بھی موجود ہیں جنسے اس کے ایک اعلیٰ شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً بزم آرائے عنصری کی بیاض میں جو خود عنصری کے قلم سے لکھی ہوئی تھی محمود کی غزل مرقوم ہے :-[1]

من گر دل خویش ہوائے تو نہ نہادم	با مہر تو پیوستم و از خویش بریدم
دیگر ز بتاں چوں تو ندیدم زپے آنک	بُت نیست بجائے کہ من ایجا برسیدم
با من نخجند آن کہ چو او کس نہ گرفتم	نگرفت سر زلف تو ہر چند خمیدم
چون زلف شدم دست و چو بتخانہ شدم پے	چون زلف تو کا دیدم و چوں روئے تو

[1] ان معلومات کے ماخذ حسب ذیل ہیں :-
[2] شعر العجم شبلی نعمانی جلد اول صفحہ ۴۶
[3] لباب الالباب محمد عوفی حصہ اول صفحہ ۲۹۳ تا ۲۹۴
[4] آثار الکرام مطبوعہ اردو صفحہ ۳۷۵

گفتم کہ یکے بندہ خریدم بدرم من — نے نے غلط است ایں کہ خداوند خریدم

محمد عوفی نے شاہی شعرا میں محمود کا ذکر دوسرے نمبر پر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "غرض از تقریر ایں فصول آن ست کہ اورا طبع شعر بودہ است" (دیکھو لباب حصہ اول صفحہ ۲۴) گلستان نامی ایک کنیز نقی سلطان کو اس سے دلی محبت تھی جب اس کا انتقال ہوا تو محمود نے ذیل کا مرثیہ لکھا:-

چوں تو اے ماہ زیر خاک شدی — خاک را بر سپہر نصل آمد
دل جزع کرد و گفتم اے دل! صبر — ایں قضا از خدائے عدل آمد
آدم از خاک بود خاکی شد — ہر کہ زو زاد باز اصل آمد

سلطان محمود نے اپنی وفات کے قریبی زمانہ میں یہ نہایت مشہور قطعہ لکھا جسکو متاخر تذکرہ نویسوں نے اوروں کی طرف منسوب کر دیا ہے:-

نہیم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشائے — جہاں مسخر من شد حوتن مسخر نائے
گہے بغرد چو دولت ہمی نشستم شاد — گہے ز حرص ہمی رفتمی ز جائے بجائے
بسے تفاخر کردم کہ من کسے ہستم — کنوں برابر بینم ہمی امیر و گدائے
....
ہزار قلعہ کشادم بیک اشارت دست — بے مصاف شکستم بیک فشردن پائے
چو مرگ تافتن اورد ہیچ سود نکرد — بقا بقائے خدائست و ملک ملک خدائے[۵۱]

ان اشعار کو دولت شاہ نے سلطان سنجر سلجوقی سے منسوب کیا ہے۔

اچھے کا خیال ہے کہ چھ غزلیں بھی محمود غزنوی سے منسوب پائی جاتی ہیں لیکن ان کے متعلق شبہ ہے کہ آیا وہ محمود غزنوی کی بھی ہیں یا نہیں[۵۲] افسوس ہے کہ موجودہ تاریخوں سے کوئی ایسا ٹھوس مواد حاصل نہیں ہو سکتا جس کے ذریعہ سے ہم محمود کی ذاتی لیاقت اور ذوق علم کا صحیح اندازہ لگا سکیں اور اس پر کافی بحث کریں اگر ابوالفضل بیہقی کی تاریخ یمینی، یا مقامات محمودی یا تاریخ محمودی، تاج الفتوح، مقامات ابوالفرمشکان، تاریخ ملا محمد غزنوی اور تاریخ محمود دراق موجود ہوتیں تو ہم کو محمود کی ذات کے متعلق بہت کچھ معلومات دستیاب ہوتیں تاہم اب بھی کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ محمود خود بھی ایک شاعر اور عالم شخص تھا۔

محمود کی زندگی کے علمی و ادبی پہلو کے متعلق جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ سب سے پہلے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ عالموں شاعروں کا حقیقی قدر دان نہ تھا بلکہ انھیں اپنی شہرت کے بھینٹ چڑھایا کرتا تھا۔ اس بارے میں پروفیسر براؤن جیسا محقق اور سنجیدہ مذاق رکھنے والا شخص بھی جادۂ اعتدال و انصاف سے ہٹ گیا ہے[۵۳]۔ محمود کی اس قسم کی طرز عمل کی مثال ابوریحان بیرونی کے اس واقعہ سے دیجاتی ہے

---

۵۱ ماخوذ از تنقید شعر العجم محمود شیرانی مطبوعہ اردو جلد دوم حصہ ہشتم صفحہ ۵۲۸ ۵۲ دیکھو براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحہ ۱۱۷
۵۳ ان کتابوں کے لکھنے کے متعلق خود بیہقی نے اپنی تاریخ مسعودی میں ذکر کیا ہے اگرچہ وہ اب کہیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ دیکھو تاریخ بیہقی مصحح مارلے مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۲ء صفحات ۱۵۸ اور ۱۶۷
۵۴ دیکھو لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحات ۱۹۵ اور ۱۵۲۔

جو چہار مقالہ کی ایک حکایت میں بیان کیا گیا ہے کہ :-

"یمین الدولہ سلطان محمود بن ناصر الدین شہر غزنین بر بالائے کوشکے در چہار دری نشستہ بود بباغ ہزار درخت روے بابوریحان کرد و گفت من ازیں چہار در از کدام در بیروں خواہم رفت حکم کن و اختیار آں بر پارۂ کاغذ نویس و در زیر نہالی کن تہ۔ و ازیں ہر چہار در راہ گذر داشت ابوریحان استطلاب خواست و ارتفاع بگرفت : طالع راست کرد و ساختی اندیشہ نمود و بر پارہ کاغذ نبوشت ۔ و در زیر نہالی نہاد۔ محمود گفت حکم کردی۔ گفت کردم۔ محمود فرمود تا کنند بہ و میشہ و پیل آوردند بر دیوارے کہ بجانب مشرق ست درے پنچمین کنند ازاں در بیروں رفت و گفت آن کاغذ پارہ بیاردند۔ بوریحان بروے نوشتہ بود کہ ازیں چہار در ہیچ بیرون نشود بہ دیوار مشرق در کنند و ازاں در بیروں شود۔ محمود چوں بخواند طیرہ گشت۔ گفت ورا بیاں سرائے فرو اندازند۔ چناں کردند مگر بایام میانگین دامے بستہ بود بوریحان براں دام آمد زمام بدرید و آہستہ بزمین فرود آمد۔ چنانکہ بروے آنگار نشد۔ محمود گفت اورا بیارید بر آوردند گفت یا بوریحان ازیں حال باری ندانستہ بودی؟ گفت اے خداوند! دانستہ بودم۔ گفت دلیل کو؟ غلام را آواز داد و تقویم از غلام بستد و تحویل خویش ازمیاں تقویم بیروں کرد۔ در احکام آن روز نوشتہ بود کہ مرا از جائے بلند بیندازند و لیکن بسلامت بزمیں آیم و تندرست برخیزم این سخن نیز موافق رائے محمود نیامد طیرہ ترگشت۔ گفت اورا بقلعہ باز دارید اور ا بقلعہ غزنین باز داشتند و شش ماہ دراں حبس بماند۔"

اسی کے سلسلہ میں ایک دوسری حکایت بھی پیش کی گئی ہے جسمیں محمود ابوریحان کو قید خانہ سے بلا کر معافی چاہتا ہے اور انعام و اکرام سے سرفراز کر کے کہتا ہے کہ "یا بوریحان! اگر خواہی کہ از من برخوردار باشی سخن برمراد من کن نہ بہ سلطنت علم خویش"

اس واقعہ کے صحیح یا جھوٹ ہونے کے متعلق فی الحال کچھ ہی نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ ضرور ہے کہ یہ حکایت نہایت شک آمیز ہے اور بہت ممکن ہے کہ غلط ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نظامی عروضی نے چہار مقالہ میں اس سے زیادہ غلط امور قلمبند کر دئے ہیں نہ صرف سنی سنائی باتوں اور قصہ کہانیوں بلکہ تاریخی امور میں بھی نظامی نے جگہ جگہ نہایت بے موقع اور ـــــ لغو واقعات لکھے ہیں۔ مرزا محمد قزوینی نے چہار مقالہ (مطبوعہ گب میموریل سیریز) پر جو مقدمہ لکھا ہے اسمیں نظامی کی جن غلطیوں کو پیش نظر کر دیا ہے اُن کے کچھ نمونے ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ نظامی نے کس قسم کی اہم تاریخی غلطیاں کی ہیں :-

(۱) ابو القاسم علی بن محمد اسکافی نیشاپوری کو نوح بن نصر بن احمد سامانی کا وزیر لکھا ہے حالانکہ وہ اس کے دادا نوح بن نصر کا

وزیر تھا۔ اور اس کے جلوس سے بیس سال قبل ہی انتقال کر چکا تھا۔ (دیکھو چہار مقالہ صفحات ۱۲-۱۶-اور ۱۰۳)

(۲) ایلتگین بانی خاندان غزنویہ کو متذکرہ بالا نوح بن منصور کا معاصر قرار دیا ہے حالانکہ وہ بھی نوح کے جلوس سے ایک عرصہ قبل ہی انتقال کر چکا تھا۔ (دیکھو صفحات ۱۴-۱۴، ۱۰۳ اور ۱۰۴)

(۳) یہ فرض کیا ہے کہ سبکتگین نے سیجوریوں سے ملکر خراسان پر لشکر کشی کی اور ایلتگین سے جنگ کی حالانکہ ایلتگین اس واقعہ سے تقریباً بیس سال قبل ہی وفات پا چکا تھا اور اس وقت بھی خود سبکتگین نے سیجوریوں سے جنگ کی تھی نہ کہ ان سے ملکر کسی اور کا مقابلہ کیا یہ نہایت مشہور تاریخی واقعہ ہے (صفحات ایضاً)

(۴) سامانیوں کے ایک مشہور سردار ابوعلی احمد بن محتاج جغانی کو (علاوہ ان غلطیوں کے جو اس کے نام شہر اور منصب کے متعلق کی ہیں اور اُس کو ابوالحسن علی بن محتاج کسانی حاجب الباب لکھا ہے) نوح ابن منصور سامانی کا معاصر خیال کیا ہے حالانکہ وہ نوح کے جلوس سے بائیس سال قبل مر چکا تھا (صفحات ۱۰۴، ۱۰۴، ۱۰۵)

(۵) سامانیوں کے اس لشکر کے سردار کو جس نے ماکان بن کاکی سے جنگ کی اور اس کو مار ڈالا "تاش سپہ سالار" کے نام سے موسوم کیا ہے حالانکہ تمام مورخین اسپر متفق ہیں کہ اس جنگ میں ابوعلی بن محتاج جغانی سپہ سالار تھا (صفحات ۱۵، ۱۶، ۱۰۲)

(۶) حسن بن سہل کو اُس کے بھائی فضل بن سہل سے ملا دیا اور حسن کو ذوالریاستین لکھا ہے حالانکہ یہ اس کے بھائی فضل کا لقب تھا۔ پوران زوجۂ مامون رشید کو فضل بن سہل کی دختر قرار دیا ہے حالانکہ وہ اس کے بھائی حسن بن سہل کی لڑکی تھی (صفحات ۱۹، ۱۰۹، ۱۱۰)

(۷) سلطان مسعود سلجوقی اور سلطان سنجر میں اشتباہ کر دیا ہے۔ اور المسترشد باللہ کی لشکر کا مقصد سلطان سنجر سے جنگ کرنا قرار دیا حالانکہ تمام مورخین اسپر متفق ہیں کہ المسترشد سلطان مسعود سے جنگ کرنے نکلا تھا نہ کہ سلطان سنجر سے (صفحات ۲۱-۲۲، ۱۱۷)

(۸) ایلک خان کو جو ماوراء النہر کے ملوک خانیہ سے تھا بغراخاں کے نام سے یاد کیا ہے اور بغراخاں کو سلطان محمود کا معاصر قرار دیا ہے حالانکہ اس کا معاصر ایلک خاں تھا (صفحات ۲۴-۲۵، ۱۲۱-۱۲۳-)

(۹) مسعود سعد سلمان کے متعلق کئی تاریخی غلطیاں کی ہیں جنکے متعلق مرزا محمد قزوینی نے حواشی میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے (صفحات ۴۴، ۴۵، ۱۷۸-۱۸۲)

(۱۰) ایک جعلی شخصیت موسوم بہ امیر شہاب الدین قتلمش الب غازی (دیکھو صفحہ ۴۵) کا جہاں ذکر کیا ہے تو ایک دو سطروں ہی میں پانچ سات ایسی غلطیاں کر دی ہیں کہ اُن کی اصلاح ناممکن سی معلوم ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ مصنف نے اُس کو اپنے ذاتی تجربہ کے طور پر لکھا ہے۔

(۱۱) یعقوب ابن اسحٰق کندی کو جو فیلسوف عرب کے نام سے مشہور ہے، جسکے آباء اجداد مشہور ترین مسلمانوں میں سے اور خلفائے بنی امیہ و بنی عباس

کے مقتدر حاکم اور عامل تھے اور جس کے جد امجد اشعث بن قیس حضرت رسول خدا صلعم کے صحابہ میں سے تھے یہودی قرار دیا ہے اور اسی بنیاد پر ایک طویل حکایت لکھی ہے جو اول سے آخر تک غلط اور لایعنی باتوں سے بھری ہوئی ہے (دیکھو صفحہ ۵۵ - ۵۶، ۲۰۳، ۲۰۴)

(۱۲) خواجہ نظام الملک طوسی کا قتل بغداد میں ظاہر کرتا ہے حالانکہ وہ نہاوند میں قتل ہوا۔ (دیکھو صفحہ ۶۶ اور ۲۶۰)

(۱۳) مشہور مسلمان طبیب محمد بن ذکریا رازی کو منصور بن نوح سامانی کا وزیر لکھدیا ہے حالانکہ وہ منصور کے سنہ جلوس سے تقریباً تیس سال قبل وفات پا چکا تھا۔ اسی باطل بنیاد پر ایک بڑی حکایت لکھی ہے جو سرتاپا بیہودگیوں سے معمور ہے (صفحات ۴۴، ۴۷، ۲۴۵، ۲۵۱)

(۱۴) ابو علی ابن سینا کو علاء الدولہ کا وزیر قرار دیا ہے حالانکہ وہ شمس الدولہ کا وزیر تھا اسی طرح اسی کا مقام وزارت ہمدان قرار دیا ہے حالانکہ وہ رے میں وزیر ہوا تھا۔

غرض جس شخص نے مشہور تاریخی واقعات کے متعلق اس قدر فاش غلطیاں کی ہیں (جن میں سے بعض کو وہ اپنا ذاتی تجربہ بھی قرار دیتا ہے) اس سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ ابو ریحان کے واقعہ میں صحت کا لحاظ رکھتا بہت ممکن ہے کہ ابو ریحان یا کسی دوسرے حکیم یا منجم کے ساتھ کسی اور بادشاہ نے اس قسم کا سلوک کیا ہو اور نظامی تک روایت اس طرح پہونچی ہو یا خود اُس نے اس کو اس طرح لکھدیا ہو۔

دوسرے قسم کا اعتراض جو محمود پر کیا جاتا ہے وہ اس کا بخل ہے۔ اس کے متعلق ابن اثیر نے چند پر لطف قصے نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے کردار میں صرف ایک چیز خراب ہے جو اس کا لالچی اور بخیل ہونا ہے۔ اسی قسم کے اعتراض میں فردوسی کا مشہور عام فسانہ بھی آجاتا ہے۔ لیکن متذکرہ بالا قصہ کی طرح فردوسی کے واقعہ کے متعلق بھی کوئی قطعی تصفیہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات ضرور ہے کہ فردوسی محمود کے دربار سے نامراد واپس گیا۔

اس کا اصلی سبب محمود غزنوی کا بخل تھا یا یہ قصہ بھی پہلے قسم کے اعتراضوں میں شامل ہے اس کی نسبت کسی ایک رائے تک پہونچنے کے لئے ہماری موجودہ معلومات ناکافی ہیں اگر بفرض محال ہم ان دونوں قصوں کو صحیح بھی تسلیم کر لیں تو ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کا محمود کے عام کردار اور علمی احسانات پر کیا اثر پڑ سکتا ہے

اگر اسوقت ہمارے علمی ذخیرہ میں محمود کے زمانہ کی تاریخیں محفوظ رہتیں تو ہم محمود کی فیاضی، سرپرستی، علوم و فنون اور قدردانی شعرا کے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کرتے تاہم اس قسم کی جس قدر بھی معلومات ہمیں دستیاب ہو سکتی ہیں انہی کے ذریعہ سے ہم یہاں محمود کے متعلق اعتراضات پر بحث کریں گے۔

(۱) ابوالفضل بیہقی نے ابوالخیر خمار نصرانی کے متعلق لکھا ہے کہ "سلطان محمود با او در نہایت اکرام و غایت تجلیل اختیار نمود بحدیکہ گویند زمین را در مقابل او بوسید" تعجب ہے کہ محمود ایک نصرانی حکیم خمار کی تو اس قدر قدر و منزلت کرے اور ابوریحان اور فردوسی کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آئے۔

(۲) عضائری غزنین آنے سے پہلے جب بہاء الدولہ بویہ کے دربار میں تھا تو ہر سال محمود کی خدمت میں ایک قصیدہ روانہ کیا کرتا تھا جس کے صلہ میں محمود اس کو ایک ہزار دینار عطا کیا کرتا تھا۔[1]

(۳) ایک دفعہ محمود کی فرمائش عضائری نے ایک رباعی لکھی جس کے صلہ میں سلطان نے دو ہزار دینار عنایت کئے اُسکے بعد عضائری نے ایک غزل پڑھی جو سلطان کو پسند آئی اور اس نے صلہ کو المضاعف کر دیا۔ اس عنایت کے شکریہ میں عضائری نے ایک طول قصیدہ لکھا جسکا مطلع یہ ہے:—

اگر مراد بجاہ اندرست و جاہ بمال مرا ببیں کہ ببینی جمال را بکمال

فرشتہ لکھتا ہے کہ جب یہ قصیدہ سلطان کے ملاحظہ میں پیش ہوا تو اس نے چودہ ہزار درم پھر عنایت کئے۔ اِس عطیہ بے کراں کو دیکھ کر عنصری نے بے حد پیچ و تاب کھایا اور اسی قصیدہ کے جواب میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے

خدائگاں خراسان و آفتاب کمال کہ وقف کرد بر او ذوالجلال عز و جلال

سلطان نے عنصری کو بھی اسی قدر قسم عنایت کی۔

(۴) عنصری کی بھی سلطان نے خاصی قدر و منزلت کی۔ ملک الشعرا کا خطاب دیکر دربار کے شاعروں کا افسر مقرر کیا اس کے جاہ و جلال اور دولت و ثروت کا یہ حال تھا کہ مشہور ہے کہ اس کا کھانا سونے چاندی کے برتنوں میں پکتا تھا اور جب وہ مکان سے باہر نکلتا تھا تو چار سو زرین کمر غلام اس کے ہمرکاب رہا کرتے تھے۔

(۵) چہار مقالہ میں لکھا ہے کہ عنصری نے جب یہ رباعی سلطان کے سامنے جاکر پڑھی ؎

کے عیب سر زلف بت از کاستن است چہ جاے بغم نشستن و خاستن است

جاے طرب و نشاط و خواستن است کار استن سرو و پیراستن است

تو سلطان کا سارا غم دور گیا اور اس نے حکم دیا کہ تین بار عنصری کا منہ جواہرات سے بھرا جائے۔ (دیکھو صفحات ۴۴-۴۵)

(۶) عنصری کی طرح فرخی بھی سلطان کی بزم ادب میں اس قدر سرفراز ہوا کہ جب باہر نکلتا بیس زریں کمر غلام اس کی سواری کے جلوس میں چلا کرتے تھے۔

[1] عضائری کو جو انعامات محمودی دربار سے حاصل ہوئے ہیں ان کی تفصیل خزانہ عامرہ میں مذکور ہے۔

(۷) ۱۳۱۳ء میں سلطان محمود نے قلعہ کالنجر کا محاصرہ کیا تو وہاں کے راجہ نندا نے ۳۰۰ ہاتھی دیکر صلح کرلی اور ہندی زبان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھکر سلطان کی خدمت میں روانہ کیا دربار میں ہند اور عرب و عجم کے جو علما تھے انھیں سلطان نے یہ قصیدہ سنایا سبھوں نے اس کی تعریف و توصیف کی تو سلطان نے اُس کے صلہ میں نندا کے تمام علاقے واپس کردئے اور علاوہ اس کے چودہ قلعوں کو اپنی طرف سے اُسے دیدیا۔[۵۱]

(۸) محمود کی "پیل بار انعام بخشیاں" ضرب المثل کے طور پر ہوگئی تھیں۔ وہ ہاتھی بھر بھر اکر انعامات دینے کا عادی تھا۔ فارسی شاعری میں ایسی تلمیحیں موجود ہیں جن میں سلطان محمود کے انعامی ہاتھیوں کا ذکر آتا ہے نظامی فرماتے ہیں[۵۲] ؎

مرا پیل بار از تو مقصود نیست — کہ پیل تو چوں پیل محمود نیست

عضائری ایک موقع پر رقمطراز ہے ؎

امید دارم کس بار صد ہزار تمام — بمن بیارد بر پائے پیل برقتیاں

ایک دوسری جگہ عضائری لکھتا ہے ؎

مرا دو بیت بفرمود شہریار جہاں — براں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال

دو ہرہ زر بفرستاد دو دو ہزار درم — بہ عسم حاسد و تیمار بدسگال نکال

خاقانی عنصری کی دولتمندی کا ذکر کرتا ہے ؎

شنیدم کہ از نقرہ زود یگداں — ز زر ساخت آلات خواں عنصری

انوری کہتا ہے ؎

چند گوئی عنصری را شعر نیکو آمدست — دولت محمود بودست آن نہ طبع عنصری

(۹) سلطان محمود اپنے دربار کے شعرا پر سالانہ چار لاکھ دینار صرف کیا کرتا تھا۔ ہر نئے شاعر کو اس کے دربار میں عزت کے ساتھ جگہ دیجاتی تھی وہ شاعروں کو دیکھکر خوش ہوتا تھا۔ فرخی کہتا ہے ؎

تو از دیدار ما ہم ہمچناں شاداں شوی شاہا — کہ ہرگز نیم از اں دامن نگشت از دیدن عذرا

طواف شاعراں بینم بگرد قصر تو ہر دم — ہمانا قصر تو کعبہ ست و گرد قصر تو بطحا

کیا فیاضیوں کے ایک ایسے ناپید اکراں بحر مواج سے تشنہ لب جانا فردوسی کی بدقسمتی نہیں ہے؟

محمود کے نزدیک۔ اس محمود کے نزدیک جس نے ابر نیساں بنکر شاعروں پر لکھوکھا اشرفیوں کی بارش کی ـــــ ساٹھ ہزار اشرفیاں

---

[۵۱] ماخوذ از آثار الکرام صفحہ ۳۷۹ جسمیں تاریخ فرشتہ اور طبقات اکبری سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔

[۵۲] دیکھو تنقید شعر العجم محمود شیرانی مطبوعہ اردو

دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن جب فردوسی کا ظرف قسمت ہی ایسا نہ ہو کہ ان کو حاصل کر سکے تو اُس کا کیا علاج؟ یہ بھی دنیائے ادب کا ایک معمہ ہے کہ معمولی سے معمولی شاعر تو لکھ کھا روپئے انعاموں میں حاصل کریں اور فردوسی جیسا زبردست شاعر اور رزمیہ نگار قطعاً محروم رہجائے لیکن کیا صرف ایک بدقسمت فردوسی کے قصہ کو چمکانا اور محمود کی دوسری تمام فیاضیوں کو تاریکی میں رکھنے کی کوشش کرنا اور اس امر کا دعویٰ کرنا کہ محمود بخیل اور حریص تھا، انصاف کا خون کرنا نہیں ہے؟

محمود بالطبع حریص سہی بخیل سہی، لیکن اُس نے عام شاعروں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ فردوسی کے ساتھ بھی سلوک کر سکتا تھا لیکن نہ معلوم کونسا ایسا منحوس واقعہ تھا کہ فردوسی کو اس کی بارگاہ سے مایوس جانا پڑا اور اس کی باعث محمود کی مخالفت میں خیالات پھیلانے والوں کو ہمیشہ کے لئے موقع مل گیا کہ وہ اس کو برا کہہ کر اس کی علمی و ادبی خدمات سے اس کی زندگی کے عظیم الشان کارناموں کو محروم کر دیں۔

اگر محمود دراصل شاعروں اور عالموں کا قدردان نہیں تھا اور اگر اس نے اپنے دربار میں ان کے ساتھ برا برتاؤ کیا تھا تو کیا آج سوائے چہار مقالہ کی ایک مشکوک روایت کے جو البیرونی کی نسبت ہے اور کیا سوائے اس طشت از بام افسانے کے جو فردوسی سے متعلق ہے ہمیں اس کی ناقدردانی اور بدسلوکی کی کوئی اور مثال ہمدست ہو سکتی کیا اس کے مخالفین جنھوں نے اس کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے ان دو قصوں کے علاوہ اس قسم کے اور واقعات ثبوت کے لئے نہیں پیش کر سکتے تھے۔ اگر انہیں کہیں بھی ذرا سا ان ہو کی طرف اشارہ نظر آتا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اُس کو اجاگر کر کے محمود کی برائیوں کا ایک زبردست قلعہ تعمیر کر دیتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ محمود کی عالمگیر فیاضیوں اور قدردانیوں نے اس امر کا کہیں موقع نہیں دیا۔

اگر محمود علم و ادب کا حقیقی قدردان نہ ہوتا اور البیرونی کے شک آمیز واقعہ کے مطابق وہ اپنے دربار میں علما و فضلا کو ذلیل کیا کرتا تو کیا اُس کے بعد کے مصنفین اس امر کی طرف کہیں بھی اشارہ نہ کرتے؟ اس قسم کی شکایت کے برخلاف جب ہم محمود کے بعد کی چند تاریخوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں حسب ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں:۔ (۱) احمد عوفی۔ لباب الالباب میں محمود کی جہانگیری اور کشورکشائی وغیرہ کے ذکر کے بعد لکھا ہے:۔

"با این ہمہ مشاغل از تربیت علما و اماثل ہیچ دقیقہ اہمال نکردے و مجادرت ایشاں رغبت صادق داشتے و مجادرت ایشاں استیناس جستے و شعرا را صلات فاخرہ و جواہر متواتر مودے تا لاجرم ہریک بقدر وسع و طاقت خود ذکر جمیل و نام نیک او را مخلد گردانیدند و بنظم و نثر تازی و پارسی در محامد و مآثر او دفترہا ساختند (دیکھو جلد اول صفحہ ۲۴)

(۲) حمداللہ مستوفی اپنی تاریخ گزیدہ میں محمود کے متعلق رقمطراز ہے:۔

"مآثر او از آفتاب روشن تر است و مساعی او در روزگار از شرح و وصف مستغنی کتاب یمینی تقامات

ابو نصر مشکان و مجلدات ابو الفضل شیبانی شاہد حال ادست علما و شعرا را دوست داشتے و در حق ایشاں عطائے جزیل فرمودے ۔ ہر سال زیادت از چہار صد دینار او را و ایدین جماعت صرف شدے

(دیکھو صفحہ ۳۹۵)

(۴) مجمع الفصحا میں محمود کے متعلق لکھا ہے :-

چون دولت ملوک آل ناصر دغزنویہ بلند آوازہ آمد سلطان محمود بن ناصر الدین سبکتگین در تربیت شعرا کوشیدہ و بہ تکمیل مستعدان عہد جہد کرد چنانکہ ثروت حکیم ابو القاسم عنصری از دولت عبد اللہ رودکی در گذشت و چہار صد تن شاعر ماہر نادر دوران والا دولت تربیت یافتند" (دیکھو جلد اول ذکر محمود)

(۴) سلطان کی علم دوستی کے متعلق بحر القواعد میں جو نصف قرن ششم ہجری کی فارسی زبان میں ایک تصنیف ہے اور ملک شام میں آتابک ابی سعید ارسلان کے لئے کہی گئی ہے روایت ذیل مرقوم ہے :-

سلطان غازی محمود سبکتگین گفت ہمہ مرادہائے جہاں در جہاں یافتم مگر یک آرزو در نہ تہا خواندن خبرہائے گذشتگاں دانستن پس بفرمود تا در شہر غزنین کتب خانہ بساختند چوں بشب در آمدے علما را جمع کردے تا میخواندے" (ماخوذ از تنقید شعر العجم مطبوعہ اردو بابت اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء صفحہ ۵۲۵)

(۵) سلطان محمود کے انتقال کے بعد فرخی نے جو مرثیہ لکھا ہے وہ بھی یہاں نقل کئے جانے کے قابل ہے کیونکہ وہ ایک دل کی پر خلوص صدا ہے جو اپنے محسن کی وفات سے متاثر ہونے کے بعد بغیر کسی خاص غرض کے اس سے ظاہر ہوئی ہے اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی در حقیقت شعرا کا کس قدر سرپرست و مربی تھا اور وہ اس کو کس درجہ دل سے محبت کرتے تھے۔ بعض شعر ملاحظہ ہوں :-

شہر غزنین نہ ہماں است کہ من دیدم پار — چہ فتاد است کہ امروز دگرگوں شدہ کار
کوہہا بینم پر شورش و سرتاسر کوے — ہمہ پر جوشن و جوشن در و بر خیل و سوار
مہتراں بینم بروے زناں ہمچو زناں — چشمہا کردہ ز خوں نابہ بر نگ گلنار
ملک سال دگر بار نیامد ز غزا — دشمنے روے نہاد است دریں شہر و دیار
سیر میخوردہ مگردی کہ بخفتہ ست امروز — دیر تر خاست مگر بیخ رسیدش ز خمار

خیز شابا کہ رسولان شہاں آمدہ اند — ہدیہا دارند آدروہ فرادان و نثار
کہ تو اندکہ برانگیزد ازیں خواب ترا — خفتنی فتنۂ کز خواب نگردی بیدار
خفتن بسیار اے خواجہ خوے تو نبود — ہیچ کس خفتہ ندیدست ترا زین کردار
شعرا را بتو بازار برافروختہ بود — رفتی و با تو بیکبارہ برفت آں بازار

(۶) جب سلطان علاء الدین حسین غوری نے اپنے دو بھائیوں، قطب الدین محمد اور سیف الدین سوری کے خون کا بدلہ لینے کے لئے غزنین پر حملہ کرکے اُس کو تاخت و تاراج کر دیا اور تمام غزنوی حکمرانوں (سوائے محمود مسعود اور ابراہیم) کی لاشوں اور قبروں کو اُکھاڑ پھینکا، اور محمودی نشانیوں کو ملیامیٹ کر دیا تو اس وقت فرط جوش میں اُس کی زبان پر یہ اشعار جاری تھے جو فردوسی نے محمود کی مدح میں لکھے تھے ؎

چو کودک لب از شیر مادر بشست — ز گہوارہ محمود گوید نخست
بہ تن زندہ پیل و بجاں جبرئیل — بکف ابر بہمن بدل رود نیل
جہاندار محمود شاہ بزرگ — بہ آبشخور آرد ہمی میش و گرگ

ایسے نازک موقع پر جبکہ بھائیوں کے خون کے انتقام کے لئے علاء الدین سراپا آگ بنکر جہانسوزی میں مشغول تھا اپنے دشمنوں کے بادشاہ اور اپنے بھائیوں کے قاتل کے دادا کو اس طرح بار بار یاد کرنا سوائے سلطان محمود کی علمی اقبالمندی کے ثبوت کے اور کوئی بات نہیں۔

محمود کی علمی و ادبی قدردانیوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے اور اس کے متعلق بعض مشہور مصنفین کے خیالات پیش کرنے کے بعد اب ہم محمودی عہد کے ان کارنمایاں کا ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے فارسی نظم و نثر میں کافی اضافہ ہوا، جن کے باعث ادبیات ایران ہمیشہ محمود کی مرہون منت رہینگی اور جن کے معلوم کرنے کے بعد محمود کی حقیقی علمی خدمات کا صحیح نقش ہمارے ذہنوں پر مرتسم ہو سکتا ہے۔

(۱) سلطان محمود نے اپنی بزم کے ایک رکن محمد بن محمود البدالیعی سے فرمائش کرکے نصیحت نامہ نوشیرواں کو بحر تقارب میں منظوم کرایا۔ یہ کتاب اس وقت کمیاب ہے۔ صاحب مجمع الفصحا نے اس کے متفرق اشعار نقل کئے ہیں۔

(۲) سلطان محمود ہی کے دربار کے ایک اور فرد منشوری نے صنعت ملون کو مختصر کیا۔ اس کا ذکر رشید الدین وطواط نے حدائق السحر میں کیا ہے۔ خورشیدی نے منشوری کی شرح لکھی ہے جس کا نام کنز الغرایب ہے۔[1]

(۳) سلطان محمود کے دربار کے ایک بڑے شاعر فرخی نے صنایع بدایع فارسی کے متعلق نثر میں ایک کتاب ترجمان البلاغت لکھی جو اس وقت ناپید ہے۔ رشید الدین وطواط نے اُسے دیکھا تھا۔

[1] اس حصۂ مضمون کی بعض معلومات آثار الکرام حکیم شمس اللہ قادری سے ماخوذ ہیں۔

(۴) البیرونی نے سنسکرت زبان کی تحصیل سلطان محمود ہی کے طفیل میں کی تھی۔ اگر اس کا تعلق سلطان محمود کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ سنسکرت کی بیس سے زیادہ کتابوں کا ترجمہ یا خلاصہ ہرگز نہ کر سکتا۔ نیز کتاب الہند جیسی مشہور و معروف کتاب سلطان محمود ہی کے زمانہ میں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ بیرونی کی چند اور کتابیں بھی غزنوی دربار ہی کی مرہون منت ہیں۔

(۵) بیرونی کی طرح امام ثعالبی کی بھی کئی کتابیں سلطان محمود کی قدردانیوں کی پیداوار کہی جا سکتی ہیں۔

(۶) سلطان محمود نے غزنین میں مسجد کے پاس ایک عظیم الشان مدرسہ بنوا دیا۔ اس میں کتب خانہ بھی قائم کیا جس میں نفیس و نادر کتابیں جمع کیں اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کر دئے۔

(۷) فارسی زبان کے قصیدوں میں مناظرہ نگاری کو اسی کی بزم ادب کے ایک رکن احمد اسدی نے معراج کمال پر پہونچا دیا اس کے متعلق ایتھے نے ایک نہایت فاضلانہ مضمون لکھا ہے۔

(۸) قصیدہ میں مخلص اور گریز سب سے زیادہ اہم چیزیں ہیں۔ سلطان محمود کے دربار کا ملک الشعرا عنصری سب سے پہلا شخص ہے جس نے مدح کی طرف گریز کرنے کے نہایت پر لطف اور جدت آمیز پیرائے اختیار کر کے فارسی قصیدہ گوئی میں نئے عنصروں کا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ عنصری اور فرخی نے قصیدہ کو جو اس وقت صرف مدحت طرازی اور خوشامد کے لئے وقف ہو گیا تھا واقعہ نگاری سے بھی روشناس کرایا۔ عنصری نے اپنے اکثر قصیدوں میں سلطان محمود کی معرکہ آرائیوں کے دلچسپ مرقع پیش کئے ہیں۔ فرخی نے بھی واقعہ نگاری کا خاص طور پر لحاظ رکھا اور ایسی زبان استعمال کی جو اس زمانہ کے لحاظ سے ایک معجزہ کہی جا سکتی ہے۔ قاآنی نے جو بات ایک ہزار برس کے بعد حاصل کی فرخی نے اسی زمانہ میں اسپر قابو کر لیا تھا۔ ہر قسم کے واقعات کو بے تکلفی کے ساتھ نہایت سلیس اور صاف زبان میں ادا کرنا فرخی ہی کی ایجاد ہے۔ اس نے واقعہ نگاری کی ایک شاندار شاہراہ قائم کر کے آئندہ شاعروں کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

(۹) اگرچہ سلطان محمود سے پہلے بھی فارسی شاعری میں صنائع بدائع وغیرہ کا استعمال کیا جاتا تھا لیکن اسی زمانہ میں اس کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی۔ یہ اگرچہ کوئی قابل وقعت بات نہیں ہے لیکن جہاں تک ادبیات کا تعلق ہے اس قسم کی چیزیں نئے اسالیب کے اضافہ کا باعث ہونے کی وجہ سے قابل قدر ہوتی ہیں خاص کر عنصری نے لف و نشر، ترصیع، تقسیم، سوال و جواب وغیرہ صنعتوں نیز مبالغہ اور معنی آفرینی میں اور فرخی نے صنعت تلمیح کے استعمال میں ید طولیٰ حاصل کیا تھا۔ یہ اولین نقوش تھے جن پر متاخرین نے اچھے اچھے مرقع تیار کر لئے۔

سید محی الدین قادری زورؔ (بی اے)

تین کتابیں

رسول عربی قیمت ۸؍ امت کی مائیں قیمت ۸؍ بنت الرسول قیمت ۶؍

منیجر "نگار" لکھنؤ

افشا اردو

شمالی ہند

محمد شاہی عہد میں سب سے پہلے جو حسن قبول ولی کے کلام کو حاصل ہوا وہ اور کسی شاعر کو نصیب نہ ہو سکا۔ دلی میں شاہ مبارک آبرو محمد شاکر ناجی، شیخ شرف الدین مضمون اور مصطفےٰ خاں یکرنگ جیسے اساتذہ گزرے دلی میں ولی کے کلام کے اثر سے اردو شاعری کی بنیاد پڑی اس دور میں شعرائے دلی کی شاعری ایہام گوئی اور رعایت لفظی میں ڈوبی ہوئی تھی اسوقت اردو کا کالب تیار ہوا تھا لیکن بہت بھدا۔

آبرو :— سیج اوپر غیر کے رہتا ہے اب لوٹا ہوا — زر کی لالچ اس قدر وہ بیمتن کھوٹا ہوا
مجھ نکتواں کی حالت داں جا کہے ہے اڑ کر — میرا یہ رنگ روبے گویا مکھی کبوتر

شاکر ناجی :— نہ پوچھو خود بخود اس عارض خورشید کی خوبی — لیا ہے داد حسن ماہ رویوں سے وہ کر چندے
رنگ تراگندی دیکھا اور بدن مخمل سا صاف — ہوش کھو کر آدمی بھولے ہیں اپنے خورد و خواب
وظیفہ زاگنی کے سر میں زاہد کفر ہے مت پڑ — نہیں تسبیح تیرے ہاتھ میں یہ راگ مالا ہے

مضمون :— نظر آتا نہیں وہ ماہ رو کیوں — نظر آتا ہے مجھکو چاند خالی
خوبیوں کو جانتا تھا گرمی کرینگے مجھ سے — دل سرد ہو گیا ہے جب سے پڑا ہے پالا

یکرنگ :— مجسکو معلوم یوں ہوا گل سے — بھول جاتے ہیں اُس سے دولت مند
جدائی سے تری اے صندلی رنگ — مجھے یہ زندگانی درد سر ہے

احسن :— یہی مضمون خط ہے احسن اللہ — کہ حسن خوبرویاں عارضی ہے

ان سب میں شاہ مبارک آبرو کا میلان طبیعت ایہام گوئی کی طرف زیادہ تھا چنانچہ تذکرہ قدرت میں یوں لکھا ہے

بعد از طبقہ شاعران دکن کہ معاصر ولی بود ندرواج ایہام بسیار شد سر دفتر و سر آمد ایہام گو نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو بود

محمد شاہی دور تک جو شاعری کا رنگ تھا بڑا ترمیم طلب اور اصلاح کا محتاج تھا یہ دور ختم ہونے کے بعد جب شاہ عالم کا زمانہ آیا خواجہ میر درد، فغفور دہلوی، مرزا سودا، میر حسن، مظہر جانجانان جیسے علمبرداران شاعری پیدا ہوئے ان میں سب سے پہلے مرزا مظہر جانجاناں نے اس طرف توجہ کی ایک مستقل دور تجدید و اصلاح کی داغ بیل ڈالی،

چنانچہ قدرت اللہ شوق اپنے تذکرے میں یوں فرماتے ہیں :—

می گوئند اول کسے کہ طرز ابہام گوئی [illegible] ریختہ را در زبان اردوے معلی شاہ جہاں ابرد کہ الحال پسند خاطر عوام و خاص وقت گردیدہ مروج ساختہ زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین واقف رموز خیاب اکبر کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا بیجا نجاناں تخلص بہ مظہر است

تمہید جسوقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں یعنی رنگ آباد اسوقت منتخب ملازمت تھا عالمگیر کے زمانہ میں جو رونق اسکو حاصل ہوئی تھی برستور قائم تھی بلکہ اس میں نمایاں اضافہ ہوگیا تھا نواب نظام الملک آصف جاہ کے عہد میں اس کی آبادی دس لاکھ کے قریب پہونچ چکی تھی شہر کے اطراف میلوں تک لذیذ میووں کے باغ پھیلے ہوئے تھے تجارت کا مرکز صنعت و حرفت کا گھر تھا برتن،..... ریشمی، سوتی کپڑے یہاں سے دور دور تک جاتے تھے اُس کی تصدیق مشرو ہمرو کی بنی ہوئی صنعت سے اب بھی ہو سکتی ہے اس کی گلی گلی گوجہ کوچہ عالیشان اور خوبصورت مکان رکھتا تھا اس وقت کے اورنگ آباد کا دہندلا سا خاکا نواب ناصر جنگ بہادر خلف آصف جاہ کے اس نظم سے ذہن نشین ہو سکتا ہے جو اورنگ آباد کی تعریف میں لکھی ہے ؎

نوبہار خجستہ بنیاد است — روزگار خجستہ بنیاد است
دل شکار خجستہ بنیاد است — بیقرار خجستہ بنیاد است
چوں نگردد سفید دیدۂ خلق — انتظار خجستہ بنیاد است
انتفاعے کہ سرمہ می بخشد — در غبار خجستہ بنیاد است
دلنشین طرز خنجر مژگان — خار خار خجستہ بنیاد است
سلسبیلے اگر بعالم ہست — جوئبار خجستہ بنیاد است
دلربا طرز کاکل خوباں — شب تار خجستہ بنیاد است
روز و شب جلوہ گاہ سرو قداں — رہ گذار خجستہ بنیاد است
شاہ برہان الدین قطب زماں — شہسوار خجستہ بنیاد است
دولت آباد قلعۂ بے مثل — در جوار خجستہ بنیاد است
ہر متاعے کہ ہست در عالم — در دیار خجستہ بنیاد است
شوخ تر از غزال دشت ختن — ہر شکار خجستہ بنیاد است
آں شرارے کہ نخل ایمن دشت — در چنار خجستہ بنیاد است

می کشد آنکہ دامن دل را — خارزار خجستہ بنیاد است
شکر اللہ کہ حضرت آصف — شہر یار خجستہ بنیاد است
ناصر و مہر کہ ہست از دو جہاں — دستدار خجستہ[1] بنیاد است

ذرا خیال فرمائے حکمران والا شان جس زبان میں طبع آزمائی فرمائیں اس زبان کی قسمت کے کیا کہنے دلی نے اپنے کمال کا نقش چھوڑا تھا پھر دربار میں اردو پہونچ چکی تھی اس کی ہر دلعزیزی کی انتہا نہ رہی ہر معمولی لکھا پڑھا شخص بھی طبع آزمائی کرنے لگا چنانچہ اس دور میں شاعروں کی اور خصوصاً اردو شاعروں کی ایسی کثرت ہے کہ تذکروں میں ان کے حالات پڑھتے ہوئے طبیعت گھبراتی ہے آج ہم عاجز اورنگ آبادی کو قارئین سے روشناس کرائیں گے،

مرزا عارف الدین خاں عاجز اورنگ آبادی

جنوبی ہند ان کے والد اورنگ زیب کے زمانہ میں بلخ سے ہند آئے نواب فیروز جنگ کی انپر خاص نظر تھی ان کی کوشش اور سعی سفارش سے شاہی منصب بھی ملگیا تھا ابھی عاجز بچے ہی تھے ان کے والد نے دار نا پائدار سے کوچ کیا دربار آصف جاہ کے ایک سردار تھے لشکر جنگ بہادر ان کے کفیل اور مربی ہوئے اور ان کی رفاقت میں رہے اور بچپن ہی میں ان ساتھ دکن چلے آئے اور اورنگ آباد میں پل کر جوان ہوئے وہاں کے مشہور اہل علم و فضل سے تربیت حاصل کی خداداد قابلیت ان میں پوشیدہ تھی فوراً چمک اٹھی آصف جاہی دربار میں رسائی ہوئی لشکر جنگ کی وساطت سے نواب ناصر جنگ بہادر کی سرکار سے منصب عطا ہوا خانی کا خطاب بھی ملا لیکن آمدنی قلیل تھی تنگی سے گذران کرتے تھے پھر ناصر جنگ شہید نے بخشی گیری کی خدمت سے بھی سرفراز فرمایا خود کبھی دست طلب نہیں پھیلایا اپنی خدمت کو بڑی تندہی سے بجا لاتے جہان قلم کے جوہر سے آشنا تھے وہاں تلوار کے کمالات سے بھی متصف تھے۔

گل رعنا مولفہ مجھی ناران شفیق اورنگ آبادی نے لکھا ہے کہ عاجز بڑے نڈر دوربیدہ دہن اور غوغائی اور اونچا سننے کے عادی تھے

اسوقت اورنگ آباد میں عرب عجم خراسان عراق عجم ماوراء النہر و اطراف ہند سے فضلا مشاہیر آصف جاہ بہادر کی قدردانی کی شہرت سنکر آئے تھے۔ اورنگ آباد میں اسوقت ایسی باکمال ہستیاں جمع تھیں جن پر نہ صرف اورنگ آباد کو بلکہ تمام ہندوستان کو بجا فخر ہو سکتا ہے۔ حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی جن کو فخر تھا کہ ہندوستان کے سب سے پہلے عربی کے شاعر تھے جن کا مکمل دیوان مرتب ہو چکا تھا اور جن کی طرف تو ان کو عربی کے سات دیوان مرتب کرنے پر ناز تھا دوسری طرف وہ بلند رتبہ مورخ ہونے پر بھی فخر و مباہات کے مستحق ہیں۔ سید قمر الدین جیسا علوم مشرقیہ کا جید عالم علوم و فنون کا ماہر اسی

[1] مطبوعہ دیوان میں اس کے (۹۴) شعر ہیں مومنا کلام دیا خجستہ بنیاد اورنگ آباد کا تاریخی نام ہے۔

زمانہ میں ——— حضرت سید شاہ شریف الدین جیسے اہل دل بزرگ ——— جن کے آستانے پر بسی جیا فرانسیسی سپہ سالار جبین سائی کرتا تھا۔ اورنگ آباد ہی میں تھے۔

اورنگ آباد میں ایک طرف تو ماہرین علوم و فنون کا مجمع تھا تو دوسری طرف شاعروں کا بھی ہجوم تھا آصفیہ سرکار علوم و فنون کے لحاظ سے ہارون اور مامون کا دربار تھی تو شعر و شاعری کے اعتبار سے سنجر کی محفل،
خود فرماں روائے وقت شاعری کے والا و شیدا تھے خود بھی شاعر تھے حضرت آصف فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے نواب ناصر جنگ شہید نے فارسی کے تین ضخیم دیوان چھوڑے ہیں جو چھپ چکے ہیں انھوں نے فارسی کے ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے ذیل میں ہم اپنے قلمی دفینہ کشکول سے اردو شعر کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

یار خورشید نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا ذرے ذرے میں عیاں تھا مجھے معلوم تھا

دل جو لعل لب کافر پہ گرا ٹوٹ گیا جام بلور تھا پتھر پہ گرا ٹوٹ گیا

چھوڑ کر مار سیاہ لاتا ہے انعی ڈھونڈھ کر بل بے سود از لف کا پیچھا نہ چھوڑا سانپ کا

قید سین چھوٹا ہے دجال قیامت آئی جو بلائیں سیں گئی تھی وہ سلامت آئی

عاجز ۱۱۷۷ھ میں مرض اسہال سے مبتلا ہو کر سخت علیل ہو گئے اور اپنی زندگی سے مایوس ہو کر مرزا معز الدین منوسوی تمی خوانی کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ آپ میری رحلت کی تاریخ لکھ دیجئے مرا پیمانہ عمر لبریز ہو چکا مرزا صاحب یہ پیغام سنکر ہنس پڑے اور جواب میں لکھ بھیجا کہ آپ کو تاریخ گوئی پر عبور حاصل ہے۔ خود ہی تکلیف فرمائیں تو اچھا ہے عاجز مرزا کا یہ جواب سنکر ہنس دئے اور اپنے نام اور تخلص کے اعداد جمع کر کے فرمایا کاش مجھے مری موت ایک سال مہلت دے تو یہ تاریخ ہم نام دہم رحلت ہو جائیگی حسن اتفاق سے آپ کی دعا قبول ہوئی اور آپ تندرست ہو گئے اور ایک سال گذرنے پر آپ کا طائر روح گلشن خلد کی طرف پرواز کر گیا۔ میر اولاد حسین ذکا بلگرامی نے یہی مادہ تاریخ آپ کے نام و تخلص سے نکالا ہے یہ عجب توارد تھا تاریخ فوت (عارف الدین خاں عاجز) آپ کا مزار محلہ وزیر آباد کے متصل ضلع ناندیڑ میں ہے۔ عاجز کی تصنیفات یہ ہیں فارسی کا دیوان اردو دیوان مثنوی لعل و گوہر جو (۵۰۰) ابیات پر مشتمل ہے تعجب ہے کہ حکیم سید شمس اللہ قادری مولف اردوے قدیم نے اُس کو محمد علی عاجز دکنی کی تصنیف بتلائی ہے حالانکہ شفیق نے جو ان سے مل چکا تھا اور ان کا ہموطن تھا عاجز اورنگ آباد سے منسوب کیا ہے۔

دوسرے غلام قادر سامی جو اسی دور کے شاعر اور عاجز کے ہمعصر تھے انھوں نے عاجز اورنگ آبادی کی رد میں طالب موہن ایک مثنوی لکھی ہے۔

مثنوی لعل وگوہر پر مولانا عبدالباری فاضل فرنگی محلی کا ایک مضمون رسالہ کیف ماہ اگست ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا ہے تاریخی وتحقیقی نقطۂ نظر سے ان کے تبصرے میں جابجا خامیاں پائی جاتی ہیں فاضل مقالہ نگار کا بیان ہے کہ یہ مثنوی طبع نہیں ہوئی ہے حالانکہ یہ مثنوی بمبئی اور مدراس میں چھپ چکی ہے اور میرے کتب خانہ میں ہر دو نسخے موجود ہیں۔ ذیل کے تذکروں میں انکا ذکر آتا ہے:

محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن صـ۲۴۰ گل رعنا مولفہ عبدالحی لکھنوی تاریخ اردوے قدیم صـ۳۴ مولفہ حکیم سید شمس اللہ قادری تاسی جلد اول صـ۱۶۸ اسپرنگر صـ۵۹۹ اسٹوارٹ صـ۱۶۲ ایتھے نمبر ۱۶۱۷ لسان العصر جلد اول نمبر ۵ صـ۳۵ رسالہ کیف اگست ۱۹۲۷ء صـ۱۱۵ تذکرہ شعرائے اورنگ آباد۔ تذکرہ تمنا موجودہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی

چمنستان شعرا وگل رعنا مولفہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی قلمی موجودہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی۔

تحفۃ الشعرا محمد افضل بیگ قاقشال قلمی موجودہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی

تذکرہ نویسوں کی رائے

محمد افضل بیگ قاقشال مولفہ تحفۃ الشعرا (شعر ریختہ نظیر خود نداشت)

تذکرہ نویس تمنا (بر علوم عربی دکسبی قادر بود تمام فنون شریفہ ماہر)

لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی چمنستان شعرا۔

عارف الدین خاں عاجز پہلوان شہ زور سخنوری ورستم معنی پروری نہنگ دریائے شیریں مقالی ضیغم نیستاں رنگین خیالی شاعر نسبت زبردست ومعنی آفرین است صاحب قدرت زمینہائے سنگلاخ ریختہ گوئند وقوافی تازہ دلچسپ بکار می برد وہیچ عاجز نمی ماند چنانچہ خود می گوئید۔

کہتے ہیں سنگلاخ زمینوں میں ہم تو شعر — پانا ہماری شوخی معنی کو ہے بکٹ

نکات الشعرا میر تقی میر:—

دوازدہ سال شدہ باشد کہ در شاہجہان آباد تشریف داشت بندہ شورا وشنیدہ بودم از چندیں سمت دکن رفتہ اکنوں از زبان سید مذکور بوضوح می پیوندد کہ برہانپور است دیگر برحسب دلنشیں اطلاع ندارم زبانش بزبان او بایشان است اکثر ریختہ بحر کبت می گوئید۔

دس بارہ سال ہوے دلی میں موجود تھے اور میں نے انکا شہرہ سنا تھا کچھ دنوں سے دکن کیجانب گئے ہوئے ہیں اور سید مذکور کی زبانی معلوم ہوا کہ برہانپور میں مقیم ہیں ان کے حسب ونسب کی خبر نہیں اُن کی زبان بازاری لوگوں کی سی زبان ہے بحر کبت میں زیادہ شعر کہتے ہیں۔

میر کو عاجز کے بارے میں بڑی غلط فہمی ہوئی (سید عبدالعلی عزلت) کی زبانی جو کچھ سنا تھا وہ عارف الدین خاں عاجز۔ اورنگ آبادی کے نسبت نہ تھا بلکہ عارف الدین خان رفیق برہانپوری کے تعلق ہے اسی دور میں اس نام کے برہانپوری شاعر گذرے

ہیں برہانپوری عارف الدین خان کے لئے دیکھو محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن صہ ۴۶۸

مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے تو اور بھی غضب کیا میر کی تردید تو کیسی ایک اور عاجز کو عاجز اورنگ آبادی کی شخصیت پر گمان کیا حالانکہ میر حسن نے جس عاجز کا ذکر کیا ہے وہ غیر اورنگ آبادی ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو صہ ۱۱۳۵

محب مکرم مولوی عظمت اللہ خاں صاحب اورنگ آبادی جنھوں نے اپنے کتب خانہ سے عاجز کا قلمی دیوان عنایت فرمایا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ عاجز اور ان کے دادا کا یارانہ تھا اور انہی کا قول ہے کہ عاجز شاہ شریف الدین اورنگ آبادی کے مرید بھی تھے یہ تو ضرور ہے کہ عاجز شاہ ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اس لئے کہ جسوقت شاہ صاحب ممدوح نے ایک مسجد تعمیر کرائی تو عاجز نے اس کی تاریخ لکھی :-

این مسجد شریف حریم جہاں نما
۱۱۲۶ھ

عاجز اورنگ آباد کے مشہور تاریخ گو گذرے ہیں انھوں نے کئی تاریخیں لکھی ہیں چنانچہ محمد افضل بیگ قاقشال مولفہ تحفۃ الشعرا کے مکان کی تاریخ فی البدیہہ لکھی ہے۔

منزل عیش بہ از چار محل — کرد بنیاد چو مرزا افضل
گفت تاریخ بنائش ہاتف — منزل جاہ و مکان افضل
۱۱۴۲ھ

محض تاریخ کہدینے سے وہ مرید نہیں ہو سکتے یہ ممکن ہے کہ وہ مرید ہوں مگر جب تک واقعات اس کی تائید نہ کریں ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے عاجز کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شیعی عقیدہ رکھتے تھے۔

روز محشر میں بچا لینگے تجھے بارہ امام — مت سقر کے ڈر سے عاجز فکر سات اور پانچ کر

نعمت امید سے معمور ہے کچکول دل — جب سے عاجز ہم ہوئے ہیں شاہ مرداں کے گدا

دور آیا ہے زبوں یا اسد اللہ مدد — دل ہوا ساغر خوں یا اسد اللہ مدد

گلشن بے ہنری سبز ہے آب زر سیں — شاد ہے خاطر دوں یا اسد اللہ مدد

اپنے عاجز کو سنبھالو کہ ہے اُسکے سر پر — حشر کا شور جنوں یا اسد اللہ مدد

عاجز کی شخصیت

عاجز اورنگ آبادی خواجہ میر درد و فقیر دہلوی مرزا سودا میر حسن مظہر جانجاناں کا ہمعصر تھا عاجز نے دنیائے شاعری میں وہ شہرت عام نہیں پائی جو ان کے معاصرین کو حاصل تھی ان کے دیوان کے مطالعہ سے اُن کی محاورہ بندی اور ندرت پسندی نازکخیالی معنی آفرینی اور خیالات کی بلندی پر طبیعت بے اختیار داد دینا چاہتی ہے ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ میر اور سودا شعرائے دلی اپنے کلام میں جن محاوروں کو لکھ چکے ہیں وہی محاورے

عاجز کے کلام میں کثرت سے ملیں گے اورنگ آباد اور دلی کی زبان میں اسوقت نہایت ہی خفیف سا فرق تھا جس کو فرق نہیں کہنا چاہیے تھا لیکن عام طور پر جو محاورات دلی میں استعمال ہوتے تھے وہی بے کم و کاست عاجز کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں چنانچہ ملاحظہ ہو۔

آنکھ بھر کر دیکھنا	(عاجز اورنگ آبادی)	جو اس کے زلف و رخ کو دیکھا ہے آنکھ بھر کر	آنکھ نہ پر اس کے عاجز شام و سحر تصدق
〃	(میر دہلوی)	کبھو ہم نے نہ پایا مہرباں اے تند خو تجکو	نہ دیکھا آنکھ بھر کر ایک دم خورشید رو تجکو
جان پر کھیلنا	(عاجز اورنگ آبادی)	پڑا جو عشق بازی میں وہ اپنی جان پر کھیلا	پھر اُس سین کون ہے واقف کہ کیا کیا جیلنا جیلا
〃	(میر دہلوی)	یہ تیغ ہے یہ طشت ہے لے ہم ہیں کشتنی	کھیلے ہیں کون ایسی طرح جان پر کہ ہم
زنجیر کردن قید کرنا	(عاجز اورنگ آبادی)	جو مصور کہ تری زلف کو تصویر کرے	اس کو لازم ہے کہ اول مجھے زنجیر کرے
〃	(سودا دہلوی)	دیوانہ کون گل ہے ترا جس کو باغ میں	زنجیر کرنے موج نسیم سحر گئی
چھاتی کوٹنا	(عاجز اورنگ آبادی)	جب سین سیکھا ہے مرا طناز دل کو لوٹنا	دل مرا بیتاب ہو سیکھا ہے چھاتی کوٹنا
〃	(میر دہلوی)	کبھو میر اس طرف آکر جو چھاتی کوٹ جاتا ہے	خدا شاہد ہے اپنا تو کلیجہ چھوٹ جاتا ہے
دامن جھٹکنا	(عاجز اورنگ آبادی)	اڑائیں سر پہ ہم کیونکر نہ اب خاک[1]	گئے وہ ہاتھ سے دامن جھٹک کر
〃	(میر دہلوی)	حاصل بجز کدورت اس خاکداں سے کیا ہے	خوش وہ کہ اُٹھ گئے ہیں دامن جھٹک جھٹک کر
خوں بہا	(عاجز اورنگ آبادی)	قاتل ہمارے سر کو اڑا کر دریغ کہہ	دے خوں بہا یہ رنگ سین یوں خوں بہا سیچ
〃	(سودا دہلوی)	قاصد کو میں بھی اپنے جو کچھ کہ دوں بجا ہے	جیتا پھرے تو اجرت ورنہ یہ خوں بہا ہے
بچکنا	(عاجز اورنگ آبادی)	اے شوخ ترا جلوہ ہے بجلی کا چمکنا	رفتار ترا ہیگا غزالوں کا بچکنا
〃	(میر دہلوی)	بارے وہ مہرباں ہوا ہے	بے طرح وہ بچگیا تھا
شکار افگن کے ہاتھوں سے	(عاجز اورنگ آبادی)	اُس شکار افگن کے ہاتھوں سے رہیگا کس کا دم	جان غزالیل کی جاتی ہے جس کے تیر سین

.....

سر پٹکنا	(عاجز اورنگ آبادی)	بولے اگر وہ ہنس کر بھیجا ہے تجکو کس نے	ہٹ کر پٹک کے سر کو عاجز کا نام کہو
〃	(میر دہلوی)	یوں کانوں کان گل نے نہ جانا چمن میں آ	سر کو پٹک کے ہم پس دیوار مر گئے
نگاہ کرنا	(عاجز اورنگ آبادی)	دل ہوا ہے مبتلا تیری نگاہ پر کر نگاہ	اے کمال ابرو ہدف پر تیر کھینچا چاہیے
〃	(میر دہلوی)	اگرچہ سہل ہے پر دیدنی ہیں ہم بھی میر	ادھر کو ابرو قاتل سے گر نگاہ کریں

[1] خاک بسر کردن، سر پر خاک کرنا یعنی ڈالنا

چٹ پٹ (عاجز اورنگ آبادی) تیرے دہن کی باتیں شاید نسیم بولی جو اس طرح سیں غنچے کھلتے ہیں لال چٹ پٹ
" (سیر دہلوی) ہم عاشقوں کو مرتے کیا دیر کچھ لگی ہے چٹ جن نے دل پہ کھائے وہ ہو گیا ہے چٹ پٹ
ہوش اڑنا (عاجز اورنگ آبادی) موسفیدی نے مرا ہوش اڑایا عاجز خبر مرگ کو لایا ہے یہ کاگا کوا
" (سیر دہلوی) ہوش اڑ گئے سبھوں کے شور سحر سے اُسکے مُرغ چمن اگرچہ اک مشت پال و پر تھا
گلوں کا رنگ اڑنا (عاجز اورنگ آبادی) عزم گلشن جب کرے وہ گلشن رنگیں ادا اس کے استقبال کو اڑ اڑ کے رنگ گل چلے
(سیر دہلوی) رنگ اڑ چلا چمن سے گلونکا تو کیا نسیم ہم کو تو روز گانے بے بال و پر گیا

ان کے علاوہ عاجز کے کلام میں اور بھی محاورے ہیں جن کو اب تک اہل دلی و لکھنؤ دونوں استعمال کر رہے ہیں۔

گھر گھالنا اپنی آنکھونکا لقب کیوں نہ رکھونگا خراب کہ انھوں نے مری ارمان کے گھر گھالے ہیں
ہاتھوں ہاتھ ہمارے دل کو لئے سب نگار ہاتھوں ہاتھ اسی سے ہم ہوئے محشر برار ہاتھوں ہاتھ
تہ و بالا ڈال کر سیلی گلے میں قمریوں کے طوق سیں خانۂ گل میں خانۂ بلبل تہ و بالا کر دو
ہاتھ پر ہاتھ مارنا تمھارے ہاتھ پہ ماری تھے ہاتھ ملنے کو اڑا دئی ہو سجن وہ قرار ہاتھوں ہاتھ
جڑی باندھنا کڑکڑانا نہیں پاتا مرے رونیکو اور فریادکوں بادل برس دیکھا جھڑی کو باندہ دیکھا کڑکڑا دیکھا
دم ناک میں اور غصہ ناک پر جب سیں تم اے نازنیں سلجھے ہوئے ہو تب سیں تم دم ہمارا ناک میں غصہ تمھارا ناک پر ہے
کس کی خاطر آجان دیکھ مجکوں قرباں ہوں کسکی خاطر مانند چشم بلبل حیراں ہوں کسکی خاطر
سویرا عاجز ترے بالونیں پڑی آکے سفیدی چل گھر کوں سویرے، کہ ہوا خوب سویرا
الٹ پلٹ لکھتا ہوں جب تمھاری صفت دیکھکر فلک کرتا ہے مہر و ماہ کے اوراق الٹ پلٹ
بچھڑنا جدائی کی حکایت تو اگر گلشن میں جا رنے گلوں سے رنگ بچھڑے بلبلوں سے آشیاں بچھڑے
آنکھیں سفید ہونا کیا شرح انتظار مہ بیکراں کروں انکھیں سفید ہو گئیں یہ غم کہاں کروں

عاجز نے اپنے اس شعر میں شوخی کے ساتھ اپنے ہمعصر شاعر مرزا رفیع السودا کو مخاطب کر کے تعلی کی ہے۔

شاعر وہی ہے شہر میں مرزا کہیں جسے پر بت میں یوں تو قرس بھی مرزا رفیع ہے

خاک پائے گجرات سے ایسی ہستیاں اٹھی ہیں جن پر نہ صرف خطہ گجرات کو بلکہ تمام ہندوستان کو بجا ناز ہے لیکن عاجز اپنے کمال کے ترنگ میں یوں فرماتے ہیں۔

نہ ڈھونڈ مردم گجرات میں خرد کی بات کہ ان لنگوردنکی بستی میں بوعلی ہے ہیچ

عاجز نے اپنے دیوان میں سودا اور میر کی طرح جا بجا تعلی کی ہے اور ان کی قادر الکلامی کی آواز یں دکن سے عجم تک گونج رہی ہے

کیا ہوگیا جو چپ کے سخن کہتا ہوں عاجز
بے دھوم مرے شعر کی دکن سیں عجم تک

عاجز نے اپنے بعض اشعار میں مرزائیت کا بھی اظہار کیا ہے۔

نہ سمجھا تا دم آخر سخن کے کچھ سلیقہ کو — رکھے ہیں کیا سمجھ کر نام اس عاجز کا مرزا خاں

شاعر وہی ہے شہر میں مرزا کہیں جسے — پر بت میں یوں تو ترس بھی مرزا رفیع ہے

میر تقی میر۔ — ساری عالم پر ہوں میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا

بقول مولوی عبد الحق صاحب تعلی کی انتہا ہوگئی ہے کسی دوسرے شخص کی کیا مجال ہے کہ وہ فرمانے کا لفظ اپنے لئے اس طور سے لکھے۔ یہ میر صاحب ہی کو زیبا تھا،

عاجز نے اپنے ایک شعر میں اسی انداز سے تعلی کی ہے۔

اقلیم شاعری کا تسخیر سب کیا ہوں — ہر کوچۂ سخن میں میری دہائیاں ہیں

عاجز اور میر کا انداز بیان دوش بدوش ہے سچ تو یہ ہے کہ دونوں دنیائے شاعری کے آفتاب و مہتاب تھے اسی قافیہ اور ردیف میں میر کی بھی غزل ہے۔

تلوار غرق خوں ہے آنکھیں گلا بیاں ہیں — دیکھیں تو تیری کب تک یہ بدشرابیاں ہیں

مثال ماضی کیلئے — آنکھیں تر سیاں ہیں — چنگاریاں برسیاں ہیں

مثال ماضی بعید کیلئے — باتیں بہت بنائیاں تھیں — چہرے پر چھائیاں تھیں

مثال ماضی ناتمام کیلئے — تم سے ڈرتیاں تھیں — وہ آنکھیں مارتیاں تھیں

مثال ماضی احتمالی کیلئے — وہ آئیاں ہوں گی — ٹھٹھائیاں کھلائیاں ہوں گی

اس دور میں خواہ شمالی ہند کے شعرا ہوں یا جنوبی ہند کے دونوں نے اسکو ضروریات شاعری میں جائز کر لیا تھا، عاجز کی شاعرانہ خصوصیت بہت ممتاز حیثیت رکھتی ہیں ان کا پیرایہ بیان الفاظ کا صحیح استعمال بلند خیالی صفائی بیان سادگی فصاحت یہ ایسی خوبیاں ہیں جو ایک باکمال استاد کے کلام میں ضروری ہیں، عبرت، یاس کی جھلکیاں ان کے دیوان میں پائی جاتی ہیں ان کے عاجز اور میر کے طرز میں کوئی ایسا اہم فرق نظر نہیں آتا اور انداز بیان بھی دوش بدوش ہے نقادان ادب انتخاب کلام میر کا مطالعہ کر چکے ہیں اب انتخاب کلام عاجز کا بھی مطالعہ فرمائیں:—

بہار آئی ہماری آہ کو صیاد کیا سمجھے — اسیروں کی نوائے درد کو جلاد کیا سمجھے
جدا ہو ہمنواؤں سے قفس میں شور کرتے ہیں — کوئی عاجز ہمارا نغمۂ ناشاد کیا سمجھے

اٹھ برسے چلے جان تم آؤ گے پھر اب کب — ملجاؤ گے جیتا مجھے پاؤ گے پھر اب کب
گلزار میں گل ہنسنے لگے روتا ہے عاجز — اے غنچہ دہن اسکو ہنساؤ گے پھر اب کب

سخن کہنا ہمارا بے تکلف — تصرف ہے تصرف ہے تصرف
سنایا ہمکو وہ گلرو چمن میں — تکلف ہے تکلف ہے تکلف

ہمارے دل کو لئے سب نگار ہاتھوں ہاتھ — اسی سے ہم ہوئے صحت برار ہاتھوں ہاتھ
تمھاری پنجۂ رنگین کو گر چمن دیکھے — اڑے گلوں سے رنگ بہار ہاتھوں ہاتھ

مست آتا ہے وہ طناز خدا خیر کرے — آج آئے عاشق جانباز خدا خیر کرے
درد کے زور سے آنکھوں سے نکلتے آنسو — فاش ہوتا ہے مرا راز خدا خیر کیے
بلبلو آج ہے صیاد کے آنے کی خبر — ہم میں نہیں طاقت پرواز خدا خیر کرے
یاد میں اس نگہ مست کی عاجز دل میں — نشۂ غم ہے فلک تاز خدا خیر کرے

باتیں ہمارے دل کی اے بے نیاز سن لے — ہے جام جم کا قصہ اے مست ناز سن لے
ہو پست تیرے غم سے نقش قدم بنا ہوں — یہ عرض خاکساری اے بے نیاز سن لے

گیا ہے جاں آنکھوں سے سرک کر — رہے ہم خوب رو کر سر پٹک کر
بہار آئی ارے صیاد فریاد — قفس میں ہم پڑے ہیں تجکو تک کر
اڑائیں سر پہ ہم کیونکر نہ اب خاک — گئے وہ ہاتھ سے دامن جھٹک کر

اس زندگی میں یار وسا اہو دم کا جھگڑا — آئے تو جی کھبگڑا جائے تو غم کا جھگڑا
اس عمر بے وفا کا بھروسا چھکا چھک جب — ہکو عیاں ہوا ہے تب دم بدم کا جھگڑا
جنجال زندگی سے کیا ہو گیا جو چھوٹے — عاجز ابھی پڑا ہے ملک عدم کا جھگڑا

مہربانی ہی کبھی کرتا رہے ظالم مزاج — کون کہتا ہے کہ تو بالکل ستم کو بھول جا

رہتا ہے جو بلند قدوں کے خیال میں — اس کا تو آسمان کے اوپر دماغ ہے

یا رب آئے نہ کبھی بیڑ ہے سینہ میرا — یا د طوفاں سے مقابل ہی سفینہ میرا
اشک آنکھوں میں ترے غم سے ہیں در بلیس داغ — دیکھ لے گوہر یکتا کا خزینہ میرا
جاں کنی مجھکو ہی فرہاد کو ہی کو ہکنی — دردمندوں میں زیادہ ہی قرینہ میرا
اس سیہ چشم کی جب بزم میں ہوتا ہی حجاب — سر آکود ٹپکتا ہے یہ سینہ میرا
ہیں وہ گمنام ہوں خود نام نہ کو دوں عاجز — گر بنے مردم عنقا سے نگینہ میرا

جاں کنی کا سخن تلخ کہوں کس سے جان — سارے انجان ہیں فرہاد سا محرم نہ ملا

اے درد نوش غم کے یہ دور کیا چلا ہے — ہم جس کو صاف سمجھے نکلا وہ دل کا میلا

میں ترے غم میں ارے قاتل نپٹ بیخواب تھا — شکر تیری تیغ سے لے لیکے دم سونے لگا
باغباں جب سے ترے آنے کی پایا ہے خبر — آب شبنم سے غبار رنگ گل دھونے لگا

ازل سے مجکو دیا ہے خدا نے زبان فصیح — مرا کلام ہے اثبات میں گواہ صحیح
تیرے کمال اوپر حور و پری ہیں قرباں — تیری ادا کے اوپر حور و پری تصدق

سرگرم ناز ہو جو مست شباب اٹھی — خورشید کے جگر سے بدے کباب اٹھی

تیرے دہن کے اوپر تیری کمر کے اوپر — اے نازنیں ہمارے وہم و نظر تصدق
دندان و لب کو پیارے دیکھا ہی جب نہ آنکھ بھر — آنکھوں پہ اس نے جابجا شام و سحر تصدق

تم نے مکتوب سے ہمکو نہ کیا یاد کبھی — دل ناشاد ہمارا نہ ہوا شاد کبھی

وہ کماں ابرو کرمے جسکی کمانی کرے — دمبدم تیغ نگہ اس کو قربانی کرے

ساقی مرا چمن میں کرے گر نگاہ تر — نرگس کے جام چشمہ سے پیگا شراب زر

جب نازکا سمندوہ تنبل ڈپٹ چلے — جی گرد ہو کے اس کے قدم کے پہ بچھ چلے
ٹھہرے گی کس طرح نظر اس کے جمال پہ — جس میں نگاہ دیدۂ حیرت لپٹ چلے
ظالم لگائے تیغ تغافل سرک گیا — عاجز طمانچہ مار کے کیوں آگے ہٹ چلے

سحر اس حسن کے خورشید کو جا کر جگا دیکھا — ظہور حق کو دیکھا خوب دیکھا با صفا دیکھا
سجن کس کس مزے سے آج دیکھا ہم طرح نشاط و — اشارت کر کے دیکھا ہنس کے دیکھا مسکرا دیکھا
نہیں پایا مری دردیکو اور فرہاد کوں بالا — برس دیکھا جھڑی کو باندھ دیکھا کوہ کرا دیکھا

الٰہی کب دل غمگیں ہمارا شاد ہوے گا — یہ اجڑا شہر یار کیس طرح آباد ہوے گا
ہمارا آشنا سے چلے عندلیبوں سے کہا مل مل — کہ آخر گھر ہمارا خانۂ صیاد ہوے گا
نہ رکھنا اے صبا ہرگز قدم لا کے غنچوں پر — کہ پھٹ پھٹ کر شہید ذبح کا کفن برباد ہوے گا

دل مرا آتش غم میں نہ جلا تھا سو جلا — اشک آنکھوں سے ابل کر نہ چلا تھا سو چلا

اپنے صنم کے ہجر میں ہو غم سے آشنا — عاجز عزیز جان سے بیگانہ ہو چکا

مت پوچھ مرے دیدۂ گریاں کی حقیقت — دریا کا ابل چلنا ہے بادل کا ٹپکنا
دیکھا ہے بگولے نے مرے حال کو جب سے — سر پر وہ اڑانا خاک کو سیکھا ہے بھٹکنا

چھاتی تمھاری سخت ہے فولاد کی قسم — خوں ریز تم سدا کے ہو جلاد کی قسم
رخصت دی ہمکو باغ کی جب تک بہار ہے — صیاد تجکو مردم آزاد کی قسم
عاجز ہم اپنے دلبر خوش دل کے ہجر میں — غمگیں صدا ہیں خاطر ناشاد کی قسم

ہجر میں دل جب سے بیتاب ہے — جب سے تیرے لب کو میرا لب لگا
اشک مرے انکھ میں سیماب ہے — لب میں میرے شربت عناب ہے
بہار آئی چمن میں بے تحاشا — مرا غم سنکے مجنوں رو کے بولا
ملو لال آج دیکھیں بے تحاشا — نہیں سنتا میں حاشا ثم حاشا
سجن کا آنا سجن کا مڑنا سجن کا ہنسنا — بہار گلشن غضب خدا کا نپٹ قیامت کی کا کھلنا
خوبروئی اس میں کیا ہوگی خوب — جس نے دیکھا تجکو سر کو دھن گیا
عرق جب اس پری کے چہرہ پر نور سے ٹپکے — خجل ہو گل میں شبنم جیوں لہو ناصور سے ٹپکے
اگر کیفی سخن میرا نہال تاک کوں پہونچے — صراحی شاخ ہو جائے شراب انگور سے ٹپکے

خیال اس شوخ کا کب مجھ دل بیتاب میں ٹھہرے — کہاں بجلی کا سایہ چشمۂ سیماب میں ٹھہرے
لکھوں اپنی ستاری کی اگر گردش کو کو میں درد — ورق اڑ کر مرے ہاتھوں سے جا گرداب میں ٹھہرے
کہاں ٹھہرے سیہ مانی تری زلفوں کی لہریں — اگر ٹھہرے تو حلقے مار پیچ و تاب میں ٹھہرے

کیفی نگاہ بن دل رنجور ہو رہا ہے — یہ شیشہ مے کی خاطر سب چور ہو رہا ہے

اے کیری آنکھ والے اب کیھ تیری غم میں — دل پھانک پھانک ہوکر اچور ہو رہا ہے
اے مست ناز مجھ سے مت پوچھ میرے دلکو — مرہم لگے ہیں اُسکو انگور ہو رہا ہے
اس خوش گلو کے غم میں ہے سوز آہ ہردم — عاجز جگر ہمارا طبنور ہو رہا ہے

مرا جب اشک سُرخ اس گلبدن کے یاسمیں ٹپکے — دل نالاں ہو ہو ہو لب فریاد سیں ٹپکے
اگر تصویر اس کیفی نگہ کی کھینچوں ہستی میں — شراب پرتگالی خامۂ بہزاد سیں ٹپکے
وہ صید ناتواں ہوکر پھنسوں جا دام میں عاجز — عرق شرمندگی کا جبہۂ صیاد سیں ٹپکے

قدم رکھتا ہوں جب دشت جنوں میں بے سر و پا ہو — پھپھولے پاؤں کے کہتے ہیں نوک خار صحرا ہو
جدہر جاتا ہوں عاجز اسطرف فریاد کرتی ہیں — جنوں کے تخت کے ہے بادشاہ تم سر بصحرا ہو

عاشقی میں لباس کیا حاجت — سوزن و تار پاس کیا حاجت
عاجز کا دل نہ توڑ اے اے سنگدل صنم — یہ شیشہ خانہ حق کا ہے قہر خدا سے بچ
بڑا بگڑا بڑا شملہ بڑا کلاہ بڑا ڈاڑھا — بڑھاپا ہے بڑی محنت سے زاہد نے وقار اپنا
بدی سے یار نکر کوچہ گرد عاجز کو — دہن میں خاک ہے مشت غبار کا شکوا

خواجہ میر درد دہلوی اردو ادبیات میں صوفیانہ شاعری کے باوا آدم ہیں اور انھوں نے انسان کے عرفانی ساز کو چھیڑا ہے عاجز کے کلام میں کہیں کہیں جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

ہمکو تو جان ظاہر و باطن ہے تیری یاد — رکھتے ہیں ذکر تیرا ہی ہر دم خفی و جہر
بگلولا خاکساری کا بنے وہ دشت غربت میں — جگر میں جس کے نقش حرف وحدت آشنا بیٹھے
ذکر حق سے ہو غنی اے طالب مولا سمجھ — حجرۂ دل میں ذخیرہ حرص کا رکھنا نہیں
مجھے ترے کرم کی لذتوں کی بھوک ہے یا اللہ — کرم فرما کہ اب دل میں غضب کی بھوک ہے یا اللہ
جس جواں کے دل میں ہوگا زور یاد سرحق — اس کی آنکھوں میں نظر آتا ہے رستم زال سا
کر آرسی مثال تماشائے نیک و بد — مت کہہ کسی کے سامنے حرف قبول و رد

آج آیا ہوں سخن میں شعر عشق اللہ — بت نیاز و رند قلندر نیا عشق اللہ
عاشقی کی راہ میں سر رکھ قدم کو بھولجا — راہ جانباز و نکی تہمت بھول دم کو بھولجا

جاجز کے دیوان میں کم دبیش ڈھائی سو غزلیات ہیں یہ دیوان عاجز کے انتقال کے بعد لکھا گیا ہے۔ ختم پر یہ عبارت درج ہے
از دیوان قلمی عارف الدین خاں عاجز مرزائی دولت آباد تحریر پانزدہم محرم الحرام ۱۱۸۱ھ باتمام رسید کاتب الحروف
حقیر فقیر محمد قائم ولد شیر محمد ساکن دولت آباد

نوٹ اردو کے تیسرے دور میں جس کی جگہ ہیں اسے کی جگہ سیں، اسنام کی جگہ سانجھ، جدائی کی جگہ برہ چہرہ کی جگہ مکھ، خوشبو کی جگہ باس
تول کی جگہ بچن، ہوا کی جگہ باؤ پون دنیا کی جگہ جگ، برکی جگہ بجن۔ شہر کی جگہ نگر، جدائی کی جگہ برہ، ذرا کی جگہ ٹک،
یہ الفاظ ولی کے زمانے سے میر کے زمانہ تک بولتے تھے، بلکہ آگے چل کر ذوق اور غالب کے زمانے میں بھی شمالی ہند اور جنوبی ہند کے شعرا
اسکی پیروی برابر کرتے تھے۔

اقدس

بادۂ ناب و مجموعہ حیات فارسی میر ولی اللہ صاحب بی اے عہ
مضامین فطرت :- مجدد فلسفہ اتحاد اسلام پر ایک بیمثل تصنیف عہ
عروس ادب :- حضرت ہوش بلگرامی کے مضامین کا مجموعہ عہ
سالومی :- اسکر اوائلڈ کا نہایت مشہور ڈراما مترجمہ گورکھپوری ۱۲ر
نمکدان فصاحت :- عربی فارسی اردو کے بہترین علمی ادبی تاریخی لطائف عہ
تذکرہ بلھے شاہ :- پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات ۸ر
جہاں آرا بیگم :- شاہزادی جہاں آرا بنت شاہجہاں کی نہایت مستند تاریخ ۸ر
بندگی :- امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "العبودیت" کا بیمثل ترجمہ حقایق
دینی و تصوف کی بینظیر کتاب ..... عہ
کاس الکرام :- عمر خیام کے مفصل حالات زندگی اور مکمل شرح اس
موضوع پر یہ پہلی کتاب ۳ر
خلق عظیم :- یعنی اخلاقی مضامین پر احادیث نبوی کا ایک بیمثل مجموعہ عہ
فتنہ خلق قرآن :- امام عبدالعزیز بن یحییٰ کی کتاب "الحیدہ" کا ترجمہ
مسئلہ قرآن کے متعلق ایک بینظیر محاکمہ ..... (۱۰ر)
لسان الغیب :- حافظ شیرازی رح کی سوانح عمری اور ان کے دیوانکی
بہترین شرح جلد اول ۳ رجلد دوم عہ
یادگار غالب :- مرتبہ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی ۳ر
کلیات نظم حالی :- شمس العلما حالی کے تمام منظوم کلام ۱۲ر
نقش ارژنگ :- جلال الدین صاحب اکبر کی غزلوں کا مجموعہ عہ
الفاروق :- مکمل ہر دو حصہ معہ نقشہ دنیائے اسلام مصنفہ مولانا شبلی عہ
شہاب کی سرگذشت :- مولانا نیاز فتحپوری کا بیمثل فسانہ عہ
تاریخ دولتین :- جرجی زیدان کے تاریخ تمدن اسلامی کا ترجمہ عہ
صحابیات :- عہد سعادت کی ۸۵ خواتین کے مستند حالات عہ
جذبات بھاشا :- از مولانا نیاز ہندی شاعری کے بیمثل نمونے ۱۲ر
دیوان ولی دکھنی :- اردو شاعر کے ابوالآبا کا مجموعۂ کلام عہ
کلیات وفا رامپوری اس عہد کے بہترین غزلگو جناب وفا کا اردو فارسی کلام عہ
ایک شاعر کا انجام :- مولانا نیاز فتحپوری کا بیمثل فسانہ ۱۲ر
انتخاب اودھ پنچ :- ۱۸۷۷ء کے اودھ پنچ کا انتخاب عہ

ملنے کا پتہ
"منیجر نگار لکھنؤ"

پریم کی چوڑیاں

:- فسانہ :-

نور پور گنگا جی کے کنارے الہ آباد کے ضلع میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ پنڈت گردھاری لال اس گاؤں کے زمیندار تھے رامانشکر اُن کا اکلوتا لڑکا تھا۔ کھیتی باڑی میں بڑی برکت تھی، گھر میں غلہ کا انبار لگا تھا کسی بات کی کمی نہ تھی۔ پنڈت گردھاری لال کا لڑکا رام جیاون ذات کا برہمن تھا کسی زمانے میں اُس کے خاندان میں بھی لکشمی دیوی کا راج تھا۔ لیکن غدر میں اس کا خاندان تباہ ہوگیا جب اس نے ہوش سنبھالا تو وہ یتیم تھا۔ پنڈت گردھاری لال نے اُس کی پرورش کی اور بڑے ہوتے ہی اپنے یہاں پیادوں میں نوکر رکھ لیا۔ رام جیاون بڑا کسرتی پہلوان تھا گو اب اس کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ ہوگئی تھی پھر بھی تور پور کا تو کیا ذکر آس پاس کے گانوں میں بھی اس کی جوڑ کا کوئی دوسرا پہلوان نہ تھا۔ پنڈت گردھاری کے یہاں چار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ پھر فصل میں دس بارہ من اناج بھی مل جاتا تھا۔ گھر میں ایک اچھی ذات کی گائے تھی اس کے لئے بھوسہ وغیرہ اسامیوں سے مل جاتا تھا جب پنڈت رام جیاون اکھاڑے میں ڈنڈ پیل کر صبح کو اپنی گائے کا تازہ دودھ پی کر بھی بگڑی باندھے ہوئے اور الہ آبادی موٹی لاٹھی کندھے پر رکھکر گاؤں میں اسامیوں سے لگان وصول کرنے چلتے تو رعب چھا جاتا جو کام اور کسی پیادہ سے نہ ہوتا تو اسے رام جیاون مہاراج کے سپرد کیا جاتا۔ گھر میں اُن کی بیوی درگا اور ایک لڑکی پریم پیاری کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

رامانشکر اور پریم پیاری میں ایک سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ رامانشکر کی پیدائش کے ایک سال کے بعد رام جیاون مہاراج کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی تو رامانشکر کی ماں تلسی نے لڑکی کا نام پریم پیاری رکھا۔ گاؤں میں ایسے نام کم رکھے جاتے ہیں لیکن زمینداروں کا نام رکھا ہوا کوئی کیسے بدلتا پھر بھی پریم پیاری کو لوگ پیار میں پریما کہنے لگے۔

رامانشکر اور پریما بچپن ہی سے ایک جگہ اُٹھے بیٹھے کھیلے کودے اور گرو جی کے یہاں ایک ساتھ پڑھے بھلا انمیں محبت کیوں نہ ہوتی۔ صبح کے وقت خاک دھول میں لت پت ہو کر گھروندے بنانا دونوں کا ایک نہایت ہی پر لطف کھیل تھا پریما جب گڑیا گڈے کا کھیل کھیلتی تو رامانشکر بھی اس میں حصہ لیتا۔ ساون کے مہینے میں جب رم جھم برکھا کی بہار آتی اور تور پور کے پرفضا میدان میں گنگا جی کے کنارے گڑیوں کا میلا لگتا تو گڑیاں اپنے سسرال جاتیں پریما ہاتھ پاؤں میں مہندی رچاتی اپنی گڑیوں کو گہنے کپڑے سے سجا کر بدا کرتی گنگا جی کے کنارے جاتی تو رامانشکر بھی ساتھ جاتا اور جب پریما اپنی خوبصورت

گڑیوں کو پانی میں پھینکتی تو راما اپنی خوش رنگ نیم کی چھڑی سے پریما کی گڑیوں کو پیٹتا اور خوب خوش ہوتا۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ کھیل ہی کھیل میں دونوں میں لڑائی ہوئی کوساکاٹا مارا پیٹا اور پھر تھوڑی دیر میں ملاپ ہوگیا۔ پریما کے روٹھنے پر راما اُس کی دلجوئی کرتا اور جب راما بگڑتا تو پریما اُسکو منالیتی۔ اسی طرح ہنسی خوشی میں بچپن کا کھیل ختم ہوگیا اور دونوں نے بہار عمر کے سہانے سبزہ زار میں قدم رکھا۔ پنڈت گردھاری لال کے ایک چچیرے بھائی گلزاری لال الہ آباد میں وکیل تھے انھیں کے پاس راما کو انگریزی پڑھنے کے لئے پنڈت جی نے بھیجدیا۔ الہ آباد جانے سے پہلے جب راما پریما سے ملا تو پریما نے کہا۔ راما دیکھو الہ آباد جاکر مجھے بھول نہ جانا

"پریما تیرا کہنا ہر خیال ہے بھلا میں تجھے بھول سکتا ہوں۔ میں جب الہ آباد سے آؤنگا تو تیرے لئے بڑی اچھی اچھی چیزیں لاؤنگا"

"الہ آباد سے کب آؤ گے"

"مہینے میں ایک مرتبہ ضرور آؤنگا"

جب راما رخصت ہونے لگا تو اُس نے دیکھا کہ پریما کی کنول کی سی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ اس نے کہا پریما تو روتی کیوں ہے۔ پریما نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اس نے جلدی سے اپنے آنچل سے آنسو پونچھ ڈالے اور پھر بغیر کچھ کہے سنے اپنے گھر کے اندر بھاگ گئی

راما جب نور پور ایسے چھوٹے گاؤں سے نکل کر الہ آباد ایسے بڑے شہر میں پہنچا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اپنے چچا کی عالیشان کوٹھی دیکھکر راما کی نظر میں اپنے نور پور والے کچے مکان کی کوئی وقعت نہ رہ گئی۔ اس کا الہ آباد میں اتنا جی لگا کہ وہ عرصہ تک نور پور نہ گیا اپنے نئے دوستوں سے مل کر وہ پریما کو بھول گیا۔ اس کے چچا نے اس کے لئے کوٹ۔ پتلون اور انگریزی جوتا بنوا دیا۔ وہ فٹن پر سوار ہوکر شام کو خسرو باغ کی سیر کرتا۔ ادھر تو راما شہر کی دلچسپیوں میں اپنی دیہاتی زندگی کو محو کئے تھا اور ادھر نور پور میں پریما اس کی یاد میں تڑپتی رہتی تھی۔ وہ روز شام کی ڈھلتی ہوئی چھاؤں میں اپنے گھر کے سامنے چبوترہ پر بیٹھکر راما کی راہ دیکھا کرتی۔ بھنگ اور دھمنی کے چھپروں سے جو قدرتی راگ پیدا ہوتا وہ ایک لمحہ بھر کے لئے بھی اس کو مسرور نہ کرسکتا۔ برسات کے موسم میں جب کالی بھنور راتیں سر پر ہوتیں بجلی چمکتی بادل گرجتا۔ مور چھنگارتے۔ جھینگر الاپتے تو راما کی یاد میں پریما کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح جھڑیاں لگا دیتیں۔

خدا خدا کرکے گرمیوں کی چھٹیوں میں پورے ایک سال کے بعد راما الہ آباد سے واپس ہوا جسوقت وہ گاؤں میں پہنچا دن ڈوب رہا تھا۔ گائیں اور بھینسیں چراگاہ سے واپس ہو رہی تھیں۔ سورج دیوتا کی سنہری شعاعوں میں گائیں رنگی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے گنگا جی میں چمکتے ہوئے تارے گوالے "برہا" گاتے ہوئے چلے آرہے تھے کہیں کہیں پر چھوٹے چھوٹے بچے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ گاؤں کی بہوئیں گھڑے لئے گنگا جی سے پانی بھرنے جارہی تھیں ان میں سے ایک شوخ اور چنچل عورت نے گھونگھٹ کی اوٹ سے راما کو دیکھکر اپنی ایک سہیلی سے کہا "ارے! دیکھ تو یہ کون کرسٹان کا بچہ آگیا ہے"

اس کی سہیلی نے غور سے راما کو دیکھکر کہا۔ "یہ تو راما ہے کیا تو نہیں جانتی یہ ہمارے زمیندار کا لڑکا ہے"

ارے یہ وہی راما ہے جو دھوتی کرتا پہنے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ مٹی میں کھیلتا پھرتا تھا میں نے بالکل نہیں پہچانا تھا اور پہچانتی کیسے آج تو یہ انگریزی کپڑے پہن کر آیا ہے۔

دیہاتی زندگی میں ایک برادرانہ انس ہوتا ہے جو شہری زندگی میں نہیں پایا جاتا۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے امیر و غریب سب اسی رشتہ میں بندھے رہتے ہیں چنانچہ راما کے آنے کی خبر پاکر جگدیو لہار۔ پھلی بنیا۔ رمضان جلاہہ۔ جگرو دھوبی۔ کالکا کاچی۔ اودھین اہیر۔ رام جیاون صحارا ج وغیرہ راما کو دیکھنے آئے اور دعا دیکر چلے گئے۔

گاؤں میں بیٹھکر راما کو پریما یاد آئی رات تو کسی طرح سے اس نے بسر کی لیکن صبح اٹھتے ہی وہ اس کے مکان پر پہنچا۔ رام جیاون گنگا اشنان کرنے گئے ہوئے تھے درگا دہلیز کوٹ رہی تھی۔ راما نے کہا "موسی! پرنام"

درگا نے راما کو بیٹھتے ہوئے بھگوان تمہیں بنائے رکھیں۔ آؤ۔ آؤ اچھے تو رہے" یہ کہتی ہوئی درگا نے آواز دی۔ پریما! ارے دیکھ تیرے راما بابو آئے ہیں ان کو بیٹھنے کے لئے کچھ آسن تو دے" راما چوکے میں دودھ گرم کر رہی تھی۔ ماں کی آواز سنکر وہ جلدی سے اٹھی اور ایک کھٹولہ لاکر بچھا دیا۔ راما کو خیال تھا کہ پریما سامنے آتے ہی خوب گھل گھل باتیں کرے گی اس سے الہ آباد کا حال پوچھے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پریما بدن چرائے آنکھیں نیچے کئے ہوئے آئی اور کھٹولہ بچھاکر پھر چوکے میں واپس چلی گئی راما نے درگا سے کہا "موسی! پریما بھاگ کیوں گئی مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتی"

درگا نے چلاکر کہا۔ پریما کہاں چلی گئی ذرا ایک گلاس دودھ اور بلائی تو ڈاکٹر بھیا کو کھلا دے (ہنسکر) پریما بات نہیں سنتی ہے تم کو جو سال بھر کے بعد دیکھا ہے تو سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے۔ دیہاتی لڑکیاں بڑی ناسمجھ ہوتی ہیں"

راما "موسی میں بھی تو دیہاتی ہوں"

درگا "بھیا تمہاری اور بات ہے تمہارا اور پریما کا مقابلہ ہی کیا۔ تم پڑھے لکھے ہو لیکن پریما تو بالکل گنوار ہے۔ بس وہی تمہارے ساتھ گروجی سے کچھ ہندی کتابیں پڑھی تھیں کیا اتنے ہی سے وہ سمجھدار ہوگئی۔ نہیں بھیا نہیں وہ بڑی جاہل ہے، دیکھو نہ کئی مرتبہ پکار چکی ہوں لیکن ابھی تک دودھ لیکر نہیں آئی"

راما نے اٹھکر کہا "اچھا تو موسی میں خود ہی اس کے پاس جاتا ہوں دیکھوں تو وہ مجھ سے کیسے نہیں بولتی ہے" یہ کہتا ہوا راما چوکے میں گھسا اور درگا ہنس کر لوٹ گئی "ہاں بھیا ہاں تو ضرور پریما کو ٹھیک بنائے گا" یہ کہتی ہوئی درگا نے پھر اپنا موسل اٹھایا اور دھان کوٹنے لگی۔ جب راما چوکے میں پہونچا تو اس نے دیکھا کہ پریما ایک گلاس میں دودھ لئے ہوئے سر جھکائے چپ چاپ کھڑی ہے راما نے ہنسکر کہا "اوہو! ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مجھے پہچانتی ہی نہیں کہو اچھی تو رہیں" پریما نے دودھ سے بھرا ہوا گلاس اور ایک لٹیا میں جل بھر کر راما کے سامنے رکھدیا اور پھر دیوار کا سہارا لیکر ایک طرف کو چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ لیکن کن انکھیوں سے راما کو

دیکھتی جاتی تھی۔

راما نے کہا۔ "نہ۔ نہ پریما اس طرح سے کام نہیں چلیگا جب تک تم مجھ سے نہ بولوگی میں تمھارے یہاں کی کوئی چیز نہ کھاؤں گا تھوڑی دیر انتظار کرکے جب راما نے دیکھا کہ اس کا بھی کوئی جواب پریما نے نہیں دیا تو اُس نے اداس ہوکر کہا "اچھا پریما نہ بولو جب تم میری بات کا کوئی جواب نہیں دیتیں تو میں اب جاتا ہوں یہ کہتا ہوا راما اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت لجائی ہوئی پریما نے ایک عجیب انداز سے کسمسا کر دھیمی آواز میں کہا" ہائے راما۔ تم تو نہ جانے کیا کہتے ہو"

راما کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پریما کی پیاری آواز نے اُس کا غنچۂ دل کھلا دیا۔ اب اس نے دودھ پی لیا اور ہنستا ہوا چوکے سے باہر نکل کر کہنے لگا" موسی آخر کار میں نے پریما سے بات جیت کر ہی لی اس کی ضد میں نے توڑ دی" درگا نے خوش ہوکر کہا" وہ تمھارے ساتھ بچپن سے کھیلتی آئی ہے کہاں تک شرما سکتی تھی"

گھر سے باہر نکلتے ہوئے راما نے کہا" اوہو میں ایک بات بھول ہی گیا۔ موسی یہ دیکھو میں پریما کے لئے ایک جوڑہ چوڑیوں کا لایا ہوں۔ پریما کو دیدینا" چوڑیوں کو دیکھکر درگا بہت خوش ہوئی۔ چوڑیاں تھیں تو کانچ کی لیکن اس قسم کی قیمتی اور خوبصورت چوڑیاں اُسوقت تک گاؤں میں کسی کو نصیب نہ ہوئی تھیں۔

درگا کے بلانے پر پریما چوکے سے باہر نکلی "دیکھ راما تیرے لئے کتنی خوبصورت چوڑیاں لایا ہے" یہ کہتے ہوئے درگا نے چوڑیاں پریما کی طرف بڑھائیں۔ پریما نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُن کو لے لیا اور دزدیدہ نگاہوں سے راما کی طرف دیکھا۔ زبان سے تو اُس نے کچھ نہ کہا لیکن شرمیلی آنکھوں نے سوال کیا" کیوں جی یہ چوڑیاں کانچ کی ہیں یا پریم کی؟"

راما نے بھی اس کا مطلب سمجھ لیا اور اشاروں میں جواب دیا" یہ پریم کی چوڑیاں ہیں"

آسمان نے کروٹیں لیں زمین نے موسم پلٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے ۵ برس گذر گئے۔ اس دوران میں پنڈت گردھاری لال اور مہاراج رام جیاون بیکنٹھ سدھارے۔ راما اب ایک وجیہ لحیم شحیم جوان تھا۔ اُس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور اُس نے اپنی زمینداری کا کام سنبھالا۔ لین دین بہی کھاتہ اُس کے ہاتھ میں آیا تو اس کے مزاج میں رعونت پیدا ہوگئی۔ سب نشوں سے زیادہ تیز۔ زیادہ قاتل ثروت کا نشہ ہے راما اسی نشہ میں بیخود ہوگیا۔ وہ اپنے کاروبار میں اتنا منہمک ہوا کہ وہ الڑ کپن کی محبت کو پریما کے پریم کو۔ رام جیاون مہاراج کی وفاداری کو بالکل بھول گیا۔ اس نے ایک دن بھی بھولے سے خبر نہ لی کہ یتیم پریما اور دکھیا درگا کی کیسی گذر رہی ہے۔

رام جیاون مہاراج کے کوئی جائداد تو تھی نہیں جس سے درگا کی چین سے بسر ہوتی مہاراج کے مرنے پر جو دس بیس روپئے گھر میں تھے بھی تو وہ اُنھیں کی کریا کرم میں ختم ہوگئے۔ صرف ایک گائے گھر میں تھی ماں بیٹی کی زندگی کا اب ایک یہی سہارا تھا اُس کا

دودھ اور گھی بیچ کر ان کی بسر اوقات ہوتی کبھی کبھی فاقے بھی کرنا پڑ جاتے۔ اسی حالت میں ایک دن درگا نے پریما سے کہا "جی میں آتا ہے کہ اپنی مصیبت کا حال راما بابو سے جاکر کہوں۔ کیا وہ ایسی حالت میں ہماری مدد نہ کریں گے۔

پریما نے اداس ہو کر جواب دیا "نہیں نہیں اماں اُن کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے" ——— "کیوں ؟" ——— جب اُن کو خود خیال نہیں ہے تو ہمارے کہنے سے ان پر کیا اثر ہوگا"

"ایک دن کہکر تو دیکھوں مجھے تو پوری اُمید ہے کہ وہ ہماری غریبی پر رحم کریں گے۔ کیا تیرے باپ کا بھی ان کو کچھ خیال نہ ہوگا" مہاراج کا ذکر کرتے ہی دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ تھوڑی دیر تک دونوں خوب جی بھر کر روئیں جب کچھ جی ہلکا ہوا تو درگا نے کہا بیٹی تو سچ کہتی ہے میں کسی کے پاس نہ جاؤنگی جب ان کے جیتے جی میں نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تو اب اُن کے مرنے پر بھیک مانگ کر ان کی آتما کو دکھ نہ پہنچاؤنگی" اس کے بعد پھر دونوں میں اس قسم کی باتیں کبھی نہ ہوئیں ایک مرتبہ راما کی ماں تلسی نے درگا کو اناج بھیجا بھی لیکن اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔

سال بھر تک جس طرح سے بھی ہو سکا درگا نے دن کاٹے پھٹے کپڑوں کو سی کر کسی طرح کام چلایا۔ لیکن برسات میں ایک نئی مصیبت آئی۔ اس کا گھر چھایا نہ گیا تھا۔ برسات میں کئی دن تک موسلا دھار پانی برسا تو اس کے مکان کا ایک حصہ گر پڑا گائے وہاں بندھی ہوئی تھی دب کر مر گئی۔ اس نئی مصیبت نے ان کی پریشانیوں میں اور اضافہ کر دیا۔ گھر میں دو چار چاندی کے زیور بھی تھے وہ بک گئے پریما نے راما کی دی ہوئی۔ چوڑیاں ایک کپڑے میں باندھ کر پٹاری میں رکھدی۔ راما کی یہی ایک یادگار تھی پریما نے سوچا کہ اگر وہ اس کو بیچے رہیگی تو ٹوٹ جائیں گی۔ فکر معاش بڑی بری بلا ہے درگا اب کھیتوں اور چراگاہوں سے گوبر اٹھا لاتی پریما اپلے تھاپتی اور درگا گاؤں میں پھر کر بیچ لاتی۔ کبھی گوبر نہ ملتا تو اور بھی مصیبت ہوتی کبھی کوئی اپلے چرا لیجاتا تو فاقے کرنے پڑتے دنیا کا بھی عجیب حال ہے کوئی ہنس رہا ہے اور کوئی رو رہا ہے۔ کسی کا گھر بھرا ہوا ہے کھانے والے نہیں۔ کوئی رو رو کر زندگی کے دن کاٹتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔

راما کی بیسویں سالگرہ کا دن تھا دروازہ پر مردوں کا اور گھر میں عورتوں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف گھی کی اور دوسری طرف تیل کی پوریاں پک رہی تھیں گھی کی معزز موٹے برہمنوں کے لئے تیل کی فاقہ کش نیچوں کے لئے۔ راما کا گھر سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ عورتیں سیانے گیت گا رہی تھیں بچے خوش ہو ہو کر دوڑتے پھرتے تھے مالن پھولوں کا گجرا کیلے کی شاخیں لائی کمہارنے نئے چراغ اور ہانڈیاں دے گئے "باری" سرسبز ڈھاک کے پتل اور دونے دے گیا۔ کہار نے آکر کلسہ میں پانی بھرا۔ بڑھئی نے راما کے لئے نئی پیڑھی بنائی۔ نائن نے آنگن لیپا اور چوک بنائی۔ راما جب نہا دھو کر اچھے نئے کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تو ایک پنڈت جی کھڑاؤں کھٹ پٹ کرتے براجمان ہوئے۔ راما کو پیڑھی پر کھڑا کر کے اشلوک پڑھا ایک کچا دھاگا

سر سے پاؤں تک ناپ کر بیسویں گرہ لگائی تل ملا ہوا کچا دودھ پلایا ماتھے پر تلک لگا کر گلے میں پھولوں کا ہار ڈالکر اشیر باد دی پنڈت پنڈت جی بھلا چوک سے خالی ہاتھ کیسے اُٹھتے ان کا پیٹ بہت بڑا اور خوب پھولا ہوا تھا تلسی نے بھی اس موقع پر پنڈت جی کو خوب "دکچھنا" دی اور پنڈت جی ہنسی خوشی گھر سے رخصت ہوئے اُن کے بعد نائی۔ دھوبی۔ بھاٹ۔ کمہار۔ لہار۔ مالی وغیرہ کی باری آئی اور اُن کو بھی انعام سے خوش کر دیا گیا غرضکہ اس دن نور پور میں سوائے درگا اور پریما کے کوئی اور رامکی چشم عنایت سے محروم نہ رہا۔ ادھر تو جشن کا یہ ساماں تھا اور ادھر غریب درگا کے یہاں فاقہ تھا۔ کیونکہ ثروت کے نشہ میں جو زمیندار اپنے اس غریب اسامی کو نیوتہ دینا بھول گیا تھا۔ شام کو جب سب لوگ کھانا کر چلے گئے تو اُس کو اتفاقاً پریما کی یاد آئی اور اس نے اپنی ماں سے جاکر پوچھا "ماں جی! کیا رام جیا دن مہاراج کے یہاں سے کوئی نہیں آیا تھا؟"

تلسی "نہیں تو":- ——— "کیا تم نے اُن کو نیوتہ نہیں دیا تھا"

راما "کیا وہ بغیر نیوتہ کے نہیں آسکتی تھیں وہ ہمارے اسامی ہیں"۔

تلسی "اسامی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ مہاراج کے گھر کی اکڑ تو سارے گاؤں میں مشہور ہے ابھی تھوڑے دن ہوئے میں نے دو من اناج بھیجا تھا لیکن درگا نے واپس کر دیا۔ وہ عورت اپنے کو نہ جانے کیا سمجھتی ہے جب تک مہاراج زندہ رہے اس کا آنا جانا بھی رہا اُن کے مرتے ہی اُس نے میرے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا۔ بھلا بغیر نیوتہ کے وہ ہمارے یہاں کیوں آنے لگی"

راما چپ چاپ اپنی ماں کی باتیں سنتا رہا اس کے بعد بولا۔ خیر درگا نہیں آئی تو اس سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا مجھے ایک تھالی میں کچھ سیدھا دیدو میں اُس کو جاکر دے آؤں۔

تلسی "جب تمھاری یہی مرضی ہے تو میں کل سیدھا کسی کے ہاتھ بھجوا دونگی۔ تمھارے جانے کی وہاں کیا ضرورت ہے لوگ سنینگے تو کیا کہیں گے۔ تم خود سیدھا لے کر جاؤ گے تو درگا کے اور مزاج بڑھ جائیں گے"

لیکن راما نے ماں کا کہنا نہ مانا اسوقت اس کے سامنے اس کا گذرا ہوا زمانہ تھا۔ پریما کی بچپن کی بے لوث محبت اُس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اُس نے تلسی سے سیدھا کی تھالی منگوائی اور اسی وقت درگا کے دروازہ پر پہونچکر آواز دی درگا نے دروازہ کھولکر کہا۔ "کون"؟ راما نے جواب دیا میں ہوں راما"

"ہمارے دھن بھاگ۔ آئے اندر آئے کہئے آج اس طرف مالک کیسے بھول کر آگئے" راما کے دل میں چوٹ سی لگی اُس نے شرمندہ ہوکر کہا "ایشور جانتا ہے کہ میں گھر کے کاروبار میں ایسا پھنسا رہتا ہوں کہ کسی وقت فرصت ہی نہیں ملتی"

اس کا کچھ جواب نہ دے کر درگا نے پریما کو آواز دی "بیٹی ذرا دیا جلا دے مالک اندھیرے میں کھڑے ہیں"

پریما ایک طرف کونے میں میلی کچیلی دھوتی اوڑھے پڑی تھی۔ آج اُس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ ماں کی آواز سنکر وہ اُٹھی اور

آہستہ سے کہا "ماں جی دیا میں تیل نہیں ہے" اس کی آواز میں حسرت بھری تھی۔ گوپی یا کو رامانے نہ دیکھا لیکن اس کی آواز سن لی اور کہا "دیا جلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں اب جا رہا ہوں ماں جی نے تمھارے لئے اس تھالی میں کچھ بھیجا ہے اسکو لے لو" یہ کہکر رامانے تھالی بڑھائی۔ لیکن درگا پیچھے ہٹ گئی اُس نے اپنے کو سنبھال کر کہا "مالک ہم اس کے بھوکے نہیں ہیں"۔ یہ سوکھا جواب سُن کر رامانے میں آگیا غریبوں میں بھی خودداری کا مادہ ہوتا ہے یہ اس کو معلوم نہ تھا۔ ایک غریب برہمنی نے اس کو ذلیل کیا اُس کا اُسے سخت صدمہ ہوا اور وہ سیدھا کی تھالی لیکر درگا کے گھر سے نکل کر اپنے گھر واپس آگیا۔

رامانے جانے کے بعد پریما نے اپنی ماں سے کہا "معلوم ہوتا ہے بابو جی ناراض ہو گئے ہیں"

درگا نے جواب دیا "بھگوان راضی رہیں کسی کی ناراضگی کی کچھ پروا نہیں ہے۔

پریما اب انیسویں سال میں تھی اس کی جوانی کا چاند بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا حسن و رعنائی کی تمام خوبیاں قدرت نے فیاضی سے پریما کو عطا کی تھیں اس کے انداز میں بھولا پن۔ باتوں میں نغمہ کی دلفریبی۔ آنکھوں میں حیا اور خیالات میں پاکیزگی تھی لیکن ان سب خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ غریب کی جوانی جاڑوں کی چاندنی تھی کوئی قدردان نہ تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک غریب برہمن کی لڑکی تھی۔ دان دہیز دینے کے لئے درگا کے پاس کچھ نہ تھا جوان جہان لڑکی کو دیکھ دیکھ کر اس کے گلے سے پانی نہ اترتا تھا۔ دو چار جگہ اُس نے نسبت کا پیام بھی دیا لیکن کوئی دو سو سے کم دان لینے پر راضی نہ ہوا۔ دو سو روپے تو بہت ہوتے ہیں اُسکے گھر میں اتنے تھپر بیل بھی نہ رہے ہوں گے۔ درگا گاؤں میں جس طرف سے نکلتی لوگ اُس کو سنا سنا کر کہتے جوان لڑکی گھر میں بٹھا رکھی ہے بیاہ نہیں کرتی نہ جانے اس کا کیا ارادہ ہے" درگا لوگوں کے طعنے سنکر شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتی اس لئے گاؤں میں اُپلے بیچنا بند کر دے ایک دوسرے گاؤں میں اُپلے جا کر بیچنے لگی وہاں بھی کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے درگا کو دق کرنا شروع کر دیا۔ بیچاری کی جان بڑی مصیبت میں تھی کبھی سوچتی کہ گنگا جی میں ڈوب کر اپنی جان دیدے لیکن جب پریما کا خیال آتا تو اپنے ارادہ سے باز آجاتی۔ اب درگا دن رات اسی فکر میں رنجیدہ رہنے لگی بسا اوقات وہ پریما پر بھی خواہ مخواہ خفا ہو جاتی ذرا سی بات پر اسکو جھڑک دیتی اس پر اگر پریما رونے لگتی تو خود بھی اس کے ساتھ روتی ایک دوسرے کے دل کا حال جانتی تھی لیکن زبان پر نہ لا سکتی تھی۔ اسی طرح دن گذر رہے تھے۔ ایک دن درگا کی ایک سہیلی گورا اُس سے ملنے آئی تو اُس نے کہا "بہن! پریما کا بیاہ کب کرو گی لڑکی بہت سیانی ہو گئی ہے اُس کو کواری بیٹھا رکھنا بڑے شرم کی بات ہے گاؤں بھر میں تمھاری بڑی بدنامی ہو رہی ہے"۔ درگا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "بہن کیا بتاؤں بہت تلاش کرنے پر بھی ابھی تک کوئی بر ہی نہیں ملا"

گورا "یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن خاموش رہنے سے تو کام نہیں چلے گا میرے خیال میں تو تم کو اب دیری نہیں کرنی چاہیئے"

درگا "بہن تمھیں پریما کو کہیں ٹھکانے سے لگا دو بڑی کرپا ہوگی۔

گورا نے کہا اچھا میں دیکھوں گی۔ یہ کہکر گورا چلی گئی۔ دو چار دن کے بعد وہ پھر آئی اور اُس نے آتے ہی درگا سے کہا "رنجیجی مٹھائی کھلاؤ میں پریما کے لئے بر ڈھونڈ لائی ہوں"

درگا نے خوش ہوکر کہا "کہاں؟"

گورا "مہاراج بنسی دھر کو تو جانتی ہی ہو"

درگا "وہی نا جو امرجیہ میں رہتے ہیں"

گورا "ہاں وہی وہی"

درگا "اُن کی عمر تو بہت زیادہ ہے۔ وہ اب شادی کیوں کر رہے ہیں"

گورا "عمر ضرور زیادہ ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے وہ مرد ہیں ان کی عمر کون خیال کرتا ہے۔ ان کی جتنی عمر ہے اس عمر میں تو بہت لوگ بیاہ کرتے ہیں اور رنجیجی بدا نہ مانو تو کہوں کہ تمھاری لڑکی بھی تو بہت سیانی ہے۔ بر بالکل چھوکرا ہونے سے بھی تو کام نہیں چلے گا۔ میرا کہنا مانو تم اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو بڑے امیر ہیں بیس پچیس بیگھے موروثی کاشتکاری ہے۔ تالاب۔ باغ۔ سب ہی کچھ تو ہے اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ دان دہیز بھی نہ لیں گے۔ کہو منظور ہے کہ نہیں"

درگا بنسی دھر کے ساتھ پریما کا بیاہ کرنے کے لئے کبھی نہ راضی ہوتی لیکن جب اُس نے سُنا کہ کچھ دان دہیز بھی نہ دینا پڑے گا تو وہ مجبوراً راضی ہوگئی۔

گورا نے کہا "ایک بات اور ہے وہ یہ کہ کل کچھ عورتیں مہاراج بنسی دھر کے یہاں سے پریما کو دیکھنے آئیں گی"

درگا "بہن ایسا تو میرے یہاں کبھی ہوا نہیں میرا میکہ کھاگا میں ہے وہاں جب تک بیاہ نہیں ہو لیتا سسرال والے لڑکی کو دیکھ نہیں سکتے"

گورا "خیر تم ایک کام کرو کل سویرے پریما کو نہلا کر صاف کپڑے پہنا دینا امرجیہ سے جب عورتیں میرے یہاں آئینگی میں کسی بہانے سے پریما کو اپنے گھر بلا لیجاؤنگی اس طرح سے پریما کو وہ دیکھ لیں گی اس میں کوئی حرج نہ ہوگا"

درگا نے خوش ہوکر کہا "ہاں یہ ترکیب تو ٹھیک ہے"

"اچھا تو میں اب جاتی ہوں" یہ کہکر گورا اپنے گھر چلی گئی۔ درگا آج بہت خوش تھی۔ اس نے اپنی پٹاری کھول کر ایک پھٹی پرانی دھوتی اور شلوکہ نکال کر دھو دیا اور اُس کی مرمت کر دی۔ صبح کو گورا سے یہ سب باتیں ہوئیں اور شام تک گاؤں بھر میں اُس کی خبر ہوگئی جس کسی نے بھی سُنا کہ درگا اپنی بھول سی لڑکی کا بیاہ بوڑھے کھوسٹ بنسی دھر سے کرنے والی ہے اسی نے افسوس کیا لیکن درگا نے کسی کے کہنے سننے کی کچھ پروا نہ کی اُسکو اس کے سوا کچھ خیال ہی نہ تھا کہ جس طرح بھی ہو پریما کا بیاہ ہو جائے اور دان دہیز نہ دینا پڑے بدنامی ہوگی تو کیا اپنی فرض سے سبکدوش تو ہو جائے گی۔ پریما سے بھی کوئی بات چھپی نہ رہی سب کچھ جان بوجھ کر بھی وہ کہہ ہی کیا سکتی تھی۔ وہ دوسرا بہانہ

کرکے سر شام ہی سے لیٹ رہی اور چپکے چپکے ساری رات آنسو بہاتی رہی۔

صبح کا ذب کا وقت تھا۔ چاند دھندلی دھندلی روشنی ڈال رہا تھا کہ درگا نے پریما کو جگا کر کہا "دیا جلدی سے اٹھ گنگا نہانے چلیں آشنان کرآ۔ یہ لے شلوکہ اور دھوتی اسکو نہا کر پہن لینا۔ ہاں خوب یاد آیا ذرا ٹھہر جا" یہ کہتی ہوئی درگا نے پیٹی کھولی اور اس میں سے رنگا کی دی ہوئی کانچ کی چوڑیاں نکالیں اور بولی "تیرے بدن پر کوئی زیور نہیں ہے میں تجھے ابھی دوں گی آج تو چوڑیاں پہن لے پیچھے بہت خوبصورت اور قیمتی ہیں" پریما جواب تک خاموش سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھی چوڑیوں کو دیکھ کر یکبارگی چیخ اٹھی "نہیں ماں نہیں میں تمہارے ہاتھ پڑتی ہوں میں ان چوڑیوں کو نہیں پہنوں گی" درگا نے ڈانٹ کر کہا "پہنے گی کیسے نہیں بس چپ تو بڑی ہٹیلی لڑکی ہے۔ کہنا نہیں مانتی" یہ کہکر درگا نے زبردستی چوڑیاں پہنا دیں اور پریما کو نہانے کے لئے بھیج کر آپ کسی دوسرے کام میں لگ گئی۔ آج ہی اس مرتبہ سے عورتیں پریما کو دیکھنے آئیں گی درگا کو جلدی تھی کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو پریما نہا دھو کر فارغ ہو جائے۔ پریما جب گھر سے نکلی اس وقت بھی اندھیرا تھا وہ آہستہ آہستہ کچھ سوچتی ہوئی دریا کے کنارے پہنچی۔ ستاروں کی مدھم روشنی کے عکس سے دریا کا بعض بعض حصہ سانپ کی کینچلی کی طرح جھلک جھلک کر رہا تھا۔ تمام دنیا سنسان تھی دریا کے کنارے پریما نے دھوتی شلوکہ ایک طرف پھینک دیا گنگا مائی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولی "ماتا! میں نے کون پاپ کیا ہے جو سب کی آنکھوں کا کانٹا بن رہی ہوں۔ کیا میرے لئے دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے جو میری ماں مجھے آگ میں جھونکنے کے لئے تیار ہو گئی ہے۔ ماتا! میرے دل میں جس کی مورت بسی ہے تن من جب وہی میرا نہ ہوا تو اب دنیا میں مجھے کسی سے کچھ امید نہیں ہے۔ ماتا کیا تم بتا سکتی ہو کہ رامانے مجھے کیوں بھلا دیا۔ ماتا تم جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔ اچھا میں سمجھ گئی۔ تم کہتی ہو کہ اُن کا نام جپو۔ لیکن میں تو انکا نام آج سے نہیں بالے پن سے جپتی ہوں پھر بھی وہ میرے نہیں ہوئے۔ ماں میں دھرتی ماتا کی بیٹھ کا بوجھ ہو رہی ہوں تم اس دکھیا کو اپنی گود میں چھپا لو میں تمہارے سرن میں آئی ہوں۔" پریما کی فریاد سنکر چاند کی تھرکتی ہوئی کرنیں بالو پر لوٹنے لگیں اور گنگا مائی کی لہریں اپنا سر پٹکنے لگیں پریما آگے بڑھی پھر کچھ سوچ کر رکی اور اپنے ہاتھوں سے چوڑیاں اتار ڈالیں اور یہ کہکر کہ "میں تو پریم کی چوڑیاں پہنے ہوئے ہوں ان کانچ کی چوڑیوں کی ضرورت نہیں ہے" ان کو توڑ کر ایک طرف زمین پر پھینک دیا۔ جن چوڑیوں کو وہ کبھی اپنے جان و دل سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی تھی انھیں چوڑیوں کو آج اُس نے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالا اور پانی میں ایک قدم بڑھایا ٹھیک اسی وقت کسی کی آواز سنائی دی۔

"پریما! پریما! ٹھہرو۔ مجھ سے غلطی ہوئی مجھ سے بھول ہوئی تم مجھے معاف کر دو۔ تم میری غلطی کی سزا تمہارا جی چاہے دے سکتی ہو لیکن تم جو کچھ کرنے جا رہی ہو یہ سزا میرے لئے ناقابل برداشت ہوگی۔ پریما! زور اور طاقت سے کانچ کی چوڑیاں توڑی جا سکتی ہیں لیکن پریم کا بندھن پریم کی چوڑیوں کا تعلق کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اس کے توڑنے کی طاقت نہ تم میں ہے اور مجھ میں ہے۔ پریما! جو میں نہیں کر سکا اس کو تم بھی نہیں کر سکیں" یہ رامانی کی آواز تھی وہ اتفاقاً اسوقت گنگا اشنان کرنے کے لئے وہاں پر آگیا تھا

اُس نے پریما کی فریاد سنی - پریما کا خوبصورت مگر اداس چہرہ دیکھا - پریما کو چوڑیاں توڑتے اور ان کو پھینکتے دیکھا تو اس نے آگے بڑھکر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کو اٹھا لیا - ثابت رہنے پر بھی جن کی اُس نے کبھی کچھ قدر نہ کی تھی وہی معمولی کانچ کی چوڑیاں آج ٹکڑے ٹکڑے ہوکر اُس کے دل پر تیر و نشتر کا کام کر گئیں - دل کی گہرائیوں میں خوابیدہ محبت نے ایک کروٹ لی بچپن کی محبت نے زور مارا اور قبل اسکے کہ پریما اپنی چاندسی صورت کو گنگا مائی کی لہروں میں چھپالے راما نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھکر پریما کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑکر پانی سے باہر نکال لیا - جسطرح ہوا کے جھونکے سے درخت کا ایک ایک پتہ کانپنے لگتا ہے اسی طرح راما نے جب پریما کی باہنہ پکڑی تو جوش محبت سے پریما کا ایک ایک عضو کانپ اُٹھا اور وہ راما کے چرنوں میں جھک گئی - محبت کے آنسو دونوں کے آنکھوں سے بہ نکلے - اسوقت بادِ سحر مستی سے جھومنے لگی - رات کے جھلملاتے تارے غائب ہوگئے اور صبح ہوگئی - رنج و غم کا کہیں نشان بھی نہ رہا -

کچھ دنوں کے بعد اچھی ساعت میں راما نے پریما کے ساتھ بڑی دھوم دھام کے ساتھ بیاہ کیا - درگا اس مبارک شادی کے بعد بھی کئی سال تک زندہ رہی لیکن اس وضعدار اور آن پر مرنے والی عورت نے اپنی جھونپڑی چھوڑکر داماد کے یہاں رہنا کبھی گوارا نہ کیا -

اعظم کریوی (سابق مدیر اکبر)

سلف فیلنگ فنشن کی - انگلینڈ کی مشہور کمپنی کا بنا ہوا ہے -

انتہائی رعایت

وہ کیبٹ گولڈ پلیٹڈ رسٹواچ جسکی ڈیزائن میں آپ کو اس روپے کی گھڑی سے اعتماد کرتی ہو ہر موسم میں چلنے کا دم بھرتی ہے کاریگر کو اس کی مضبوطی پر بہت ناز ہے - از حد خوبصورت و بہت پائدار ہے - کاریگری کی جدید ساخت ہے - اسوجہ سے قیمت کم یعنے علاوہ محصول وغیرہ سات روپیہ (۷ر)

لیور پاکٹ واچ

مکمل سلور کیس کی یہ گھڑیاں وقت کی سچائی میں کافی شہرت پا چکی ہیں - گھڑیساز کا منہ دیکھنا بھی نہیں جانتیں ہمیشہ اپنا کام وفاداری سے کرتی ہیں - قیمت علاوہ محصول وغیرہ پانچ روپے (۵ر)

گھر کا چوکیدار گارنٹی ۳ سال

الارم کی گھنٹی اسقدر زبردست ہے کہ گھر والوں کیطرح ہمسایہ بھی بیدار ہو جاتے ہیں وقت کی سچائی میں ہزاروں سند میں پا چکا ہے کیونکہ کاریگر نے اس کی مشین نرالی قسم کی بنائی ہے - اسکے چلنے کے تین سال تک کے تو ہم ذمہ دار ہیں - قیمت علاوہ محصول وغیرہ (۱۰ر)

چاروں اشیاء کی قیمت صرف نو روپے آٹھ آنے

ان چاروں اشیاء کی قیمت بلکہ اصل روپے ہوتی ہے لیکن ہم ہول سیل ڈیلر (تھوک فروش) ہیں اس وجہ سے جو صاحب چاروں اشیاء ایک دم طلب کرینگے ان کو صرف نو روپے آٹھ آنہ میں روانہ کیجائینگی اور محصول ڈاک و پیکنگ بھی ہمارے ذمہ ہوگا - ایک یا دو اشیاء کے لئے کوئی رعایت نہیں +

ملنے کا پتہ نیو کمپینین اینڈ کو واچ کلاک مرچنٹس بازار چاندنی چوک ۱۴ دہلی

غالب بے نقاب

اور

ان کے الہامات شعری کے صحیح خط و خال

مرزا نوشہ غالب اپنے ایک قطعہ میں فرماتے ہیں:-

ہزار معنی سر جوش خاص لطف من است — کز اہل ذوق دل و گوش داد بر است
ز رنگاں بہ یکے گر تو اد دم رد داد — مداں کہ خوبیٔ آرائش غزل بر داست
مراست تنگ دلے فخر اوست کاں بخن — بسے فکر سا جا بداں محل بر داست
مہر گماں تو اد یقین شناس کہ دزد — متاع من ز نہانخانۂ ازل بر داست

غالب کا دعویٰ ہے کہ میرے شعر یا میرے مضمون کا کسی سے توارد ہو جائے تو میرے لئے باعث ننگ ہے مگر اس کے واسطے فخر ہے۔ وہ توارد نہیں ہے بلکہ یوں سمجھو کہ چور میرا متاع نہانخانۂ ازل سے اڑا لیگیا ہے۔ مرزا نے خدا جانے کس عالم میں یہ شعر کہدے ہم حیراں ہیں کہ یہ ننگ غالب کے لئے اگر واقعی ننگ ہے تو اُس کی کوئی انتہا نہیں ہے اور دوسروں کے واسطے اگر در اصل فخر ہے تو اس کی حد و نہایت کیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ دیوان غالب کے چند صفحوں میں معانی کا بڑا ذخار دریا موجزن ہے۔ مگر تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب دیکھنے والا دیکھتا ہے کہ اس دریائے اکثر چشمے متعارد اور اس بحر ناپیدا کنار کے بہت سے موتی حاصل دریوزہ گری ہیں۔

دیوان غالب اگر بقول ڈاکٹر بجنوری مرحوم ہندوستان کی الہامی اور مقدس کتاب ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بعض الہامی کتابوں کے الہامات بھی مستعار ہوا کرتے ہیں۔ یہ بھی ماننا پڑے گا یہاں بہت سے مضامین ایسے ہیں جو دوسروں کے یہاں سے لئے گئے ہیں۔ ایک مبصر کی سب سے پہلی نظر سرقہ اور توارد کی بحث پر جاتی ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عمومی نگاہ ان پر ڈالی جائے۔

توارد کہتے ہیں دو شاعروں کے یہاں اتفاقیہ ایک ہی مضمون کا بلا ارادہ لفظاً بہ لفظاً یا بہت تھوڑے سے تغیر کے ساتھ بندھ جانا۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ توارد ہمیشہ مشہور و معروف یا بالکل سطحی مضامین میں ہوا کرتا ہے۔ باوجود تلاش بھی کوئی ایسا مضمون نہ ملے گا جو دو شاعروں کے یہاں متوارد ہوا ہو۔ اور معروف، و مشہور نہ ہو مثال کے لئے اشعار مندرجہ ذیل دیکھئے

صائب تبریزی کہتا ہے۔

ہیچ تعریفی ترا زیبا بہ نیساید کہ شد — در تو پیدا گوہر یکتا امیر المومنین

علامہ آزاد بلگرامی اپنے اس شعر کو توارد کی مثال میں پیش کرتے ہیں۔

مطلع خورشید گر خوانم ترا الحق بجا است — از تو سبز و آفتاب آسمان سرد ری

حالانکہ بجز مضمون کے توارد کے اسمیں کوئی توارد کا کہیں پتا نہیں مگر غریب آزاد نے اس خوف سے کہ صائب متقدمین میں سے ہے اس مضمون کو اپنے یہاں سے اڑا دیا اور یہ فقرہ لکھکر دل کی بھڑاس نکالی کہ "الٰہی خانہ توارد خراب شود"

کہ چہ آفتہا بر سر معنی آفرینان مے آرد۔

اسیطرح آزاد تواردِ عجیب کی مثال میں شریف تبریزی کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

چونکرد یار رحمے زتو ای خاں چہ حاصل — زتو بود امید آنم کہ نظر کنی نکردی

میر محمد احسن ایجاد۔ — گلہ آہ از تو دارم کہ چہ کردۂ تو با من
بہ فلک ترا رسانم کہ اثر کنی نکردی

مگر یہ علامہ مرحوم کی نیک نیتی پر مبنی ہے ورنہ یہ کھلا ہوا سرقہ ہے۔ اسیطرح سرقہ کی مختلف قسمیں ہیں، ایک انتحال اور نسخ جس کی تعریف یہ ہے کہ کسی شعر کی صورت تبدیل کئے بغیر اپنے یہاں رکھ لیا جائے اگرچہ ایسے لوگ کم یاب ہیں، مگر پھر بھی کبھی کبھی بعض کی زیارت ہو جاتی ہے۔

دوسری قسم اغارہ ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ کسی کے شعر کے الفاظ میں کمی بیشی کرکے اپنا کام نکال لیا جائے۔ اس کی مثال میں مصنف بحر الفصاحت یہ اشعار پیش کرتے ہیں۔ میر ضمیر۔

پہچانتے ہو کسکی مرے سر پہ ہے دستار — دیکھو تو عبا کس کی ہے کاندھے پہ نمودار
یہ کسکی زرہ کسکی سپر کسکی ہے تلوار — میں جسپہ سوار آیا ہوں کسکا ہے یہ رہوار
باندھا ہے کمر میں جسے یہ کسکی ردا ہے
کیا فاطمہ زہرا نے نہیں اسکو سیا ہے

یہ قبا کسکی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار — یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جسے میں سینہ نگار
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینۂ جوہر دار — کس کا رہوار یہ ہے آج میں جسپر ہوں سوار
کس کا یہ خود ہے یہ تیغ دوسر کسکی ہے
(میر انیس)
کس جری کی یہ کماں ہے یہ کمر کس کی ہے

تیسری قسم سرقۂ غیر ظاہر۔ وہ یہ ہے کہ اُس کے سمجھنے میں غور و فکر کی ضرورت پڑے اور شاعر نے پہلے خیال کو اس طریقہ سے بدلا ہو کہ عام اس پر بادی النظر میں نہ پہونچ سکیں۔ مثلاً شعر ذیل ملاحظہ ہوں

میر تقی:- عجب صحبت ہے کیونکر صبح اپنی شام کرئے اب
جہاں ٹک آن بیٹھے ہم کہا آرام کرئے اب

آتش:- جب میں جاتا ہوں تو منہ پھیر کے یوں کہتے ہیں
نیند آئی ہے ہمیں آپ بھی آرام کریں

یا کسی پہلے شاعر کے کلام میں اس طریقہ سے تصرف کیا ہو کہ دوسرا شعر پہلے کی ضد معلوم ہو۔

ظہیر فاریابی:- نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا
تا بوسہ بر رکاب تنزل ارسلاں زند

سعدی:- چہ حاجت کہ نہ کرسی آسماں
نہد زیر پائے تنزل ارسلاں

مگر در اصل یہ سرقہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک قسم کا اقتباس ہے جو معیوب نہیں

شاہد معنی کہ باشد جامۂ لفظش کہن — خلعتے دانے گر حریر تازہ پوشاند خوش است

یہ سب اقسام جو لکھے گئے صرف علم معنی و بیان کی رو سے لکھے ہیں ورنہ اگر در اصل دیکھئے تو سرقہ وہی ہے کہ کسی کا خیال لے لیا جائے اور بغیر کسی ترقی کے اُس کو اپنے یہاں باندھ لیا جائے۔

غالب اپنے زمانہ کے نکتہ سنج و ہوش سارقان معنی کی شان میں یہ قطعہ کہتے ہیں۔

غالب درین زمانہ بہر کس کہ وارسی
مضمون غیر و لفظ خودش بر زبان اوست
زین مایہ از کجا کہ نبالد بہ خویشتن
ہر گنج شائگاں کہ بود سایگان اوست

[1] خزانہ عامرہ مطبوعہ نولکشور پریس صفحہ ۲۹۱

کس راز دست بُرد حیا لش نجات نیست
گر پیش از گذشتہ دگر در زمان اوست

مضمون ہر کہ را خوش ادا میکند بتا:
گوئی بہ بزم اہل سخن ترجمان اوست

اما بہ کنہ حسن ادا نارسیدہ است
مے لرزد از نہیب و دلم راز دان اوست

جز من کسے بہ نزد سخن را نمے رسد
گوش سخن شناس کہ این جنس خوان اوست

آرے نہ نیک بود نہ تمکین زہر کہ ہست
مے بانگ نہ بہر نام و نشان اوست

مضمون شعر نوش بود فے زمانہ ما
یعنی بدست ہر کہ بیفتاد آن اوست

غالب کا عقیدہ بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ بدلنا اور حسن ادا میسر نہ ہونا سرقہ ہے الفاظ کے بدل دینے سے کوئی مضمون کسی کا نہیں ہو جاتا

ایک مرتبہ ملا شیدا جو اپنے حسن طبع پر مغرور بھی تھا۔ اکابر شعرا کی مجلس علم و فضل میں آیا۔ حاضرین میں صلاح ہوئی کہ اس کی تعلی بیجا نے قافیہ تنگ کر دیا ہے لاؤ اس کو پریشان کریں۔ ملا فیروز کو آمادہ کیا کہ جو شعر یہ پڑھے اُس کے جواب میں شعر پڑھا جائے۔ اور اس کو سارق مضمون ثابت کر دیا جائے چنانچہ صلاح کے بعد ملا شیدا سے کہا گیا کہ کچھ سنائیے اُس نے اصرار کے بعد یہ شعر پڑھا:۔

چیست میدانی مے گلگوں مصفا جوہرے
حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

ملا فیروز نے کہا کہ یہ مضمون رودکی کا ہے اور فوراً یہ مصرع پڑھا:۔

عشق را پیمبر و لیکن حسن را آفریدگار توئی۔ ملا شیدا خاموش نہوا اور اپنا یہ شعر پڑھا:۔

ز بسکہ کردہ غمت بند در جگر ناخن
چو پشت ماہیم از پائے تا بسر ناخن

ملا فیروز نے کہا یہ غیاثائے حلوائی کا مضمون ہے۔

از بسکہ سینہ کندم و ناخن بران نشست
چون پشت ماہی ست سراپای سینہ ام

ملا شیدا بگڑا اور کہا کہ بڑے سخندان ہو تو لو اور سنو۔

گر بصحرا موفشانی دشت پرسنبل شود
ور بدریا رہ بشوئی خار ماہی گل شود

ملا فیروز نے کہا کہ سبحان اللہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے گھر کا ایک مضمون بھی نہیں ہے۔ یہ تو ملا کاتبی کا شعر ہے۔

گر بدریا افتد از عکس جمال او فروغ
خار ماہی را ردد در قعر دریا پایہ گل

اب تو ملا شیدا بہت برہم ہوا۔ اور کہا بڑے ہمہ داں ہو تو بتاؤ کہیں یہ بھی مضمون یاد ہے اور اپنا یہ شعر پڑھا۔

ذات تو بود صحیفۂ کون کہ کرد از روئے ادب مہر خدا بر پشت

ملا فیروز نے کہا بس رہنے دیجئے ہاتفی نے آپ سے ڈیڑھ سو برس پہلے یہ مضمون کہا ہے۔

نبوت را تو ئی آن نامہ در مشت کہ از تعظیمت آمد مہر بر پشت

ملا شیدا نہایت خفا ہوا شعر پڑھنا بند کر دیا اور اٹھکر چلدیا۔ مگر یار لوگوں نے باتیں بنا کر پھر بٹھا لیا اور شعر پڑھنے کی فرمائش کی شیدا نے پھر یہ شعر پڑھا۔

زلف او را رشتۂ جان گفتم و گشتم خجل
زانکہ ایں معنی چو زلفش پیش پا افتادہ ست

ملا فیروز نے کہا کیا کہا جائے بڑا افسوس ہے عزیزی نے یہ مضمون آپ سے پہلے کہا ہے۔

کس نیارد مصرع پیچیدہ زلف کجت
لیک ایں مضمون ترا در پیش پا افتادہ ست

بیچارہ شیدا عاجز ہوگیا۔ اور کہا بھائی خدا کے لئے معاف کرو۔ یہ تو بتاؤ میرا کوئی شعر تمہیں پسند بھی آیا ہے ملا فیروز نے کہا جو کچھ تم نے کہا ہے اس میں سے ایک شعر مجھے پسند ہے۔

[illegible] تو کز دو آئینہ را چشم نیاز شانہ را دست دعا در شب دو تو در آ

میرے تمہید مضمون سے جو کچھ مطلب نکالا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ میں غالب کے شعروں کو بھی حد سرقہ میں لانا چاہتا ہوں۔ ہرگز نہیں یہ میرا مقصود یہ نہیں ہے۔ میرے قلم کو جنبش دینے والے دو خیال ہیں۔ ایک یہ کہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم نے اپنے مقالہ دیوان غالب میں لکھا ہے کہ "دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے ایک لفظ کو جہاں تک ہو سکا ہے دوبارہ استعمال نہیں کیا ہے اس کی وجہ سحبان وائل کی طرح یہ نہیں ہے کہ وہ کسی لفظ کی تکرار نہیں کرتے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کا اعادہ نہیں کرتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ مرزا غالب کا ہر خیال اسی کا خیال ہے اور کہیں سے مستعار نہیں ہے۔

میں جب دیوان غالب اردو کو دیکھتا ہوں تو میری نگاہ اولین اس کو چار حصوں پر تقسیم کر دیتی ہے ایک جزو وہ جو متقدمین یا معاصرین غالب کے کلام سے مل جاتا ہے۔ دوسرا وہ جس میں خود غالب نے اعادہ و تکرار مضامین سے کام لیا ہے۔ تیسرا وہ جسکو سنکر سخنوران کامل آہ آہ کہنے کی فرمائش کرتے ہیں اور چوتھا وہ جو صرف مرزا کے دماغ کا نتیجہ ہے لیکن یہ حصہ بہت مختصر ہے۔

مومن، ذوق، آتش، ناسخ، تھوڑے سے تقدم اور تاخر کو ملحوظ رکھتے ہوئے غالب کے ہمعصر ہیں۔ ان کے اور غالب کے متوارد خیالات میں شناخت نہیں ہو سکتی کہ اصل مالک کون ہے مگر یہ دعوی سراسر بے دلیل ہے کہ وہ سب غالب کی ملک ہیں۔

یہ بھی ہوا ہے کہ متقدمین کے خیال کے کسی جزو خاص سے غالب نے فائدہ اٹھایا۔ مگر یہ استفادہ استحصال بالجبر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا زبان عام اور محاورات خواص کی عدم پابندی، دلی اور لکھنؤ کی زنجیر تقلید سے آزادی کے باوجود بھی خزانۂ ادب اردو کو مالا مال کرنے اور دفتر شعر ہندی کو نگارخانۂ چین بنانے کا غالب کو ہمیشہ خیال رہا۔ یہ جو انھوں نے دوسری زبانوں کے خیالات خود نیما بنا کر آپ کے سامنے رکھدئے بہر حال حقیقت جو بھی ہو ہم اپنی جستجو کی بنا پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کے بہت سے ملہمات مستعار ہیں۔ غالب کا شعر ہے:-

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

لیکن ظہوری اس خیال کو اس طرح کہہ چکا تھا:-

شد طبیب ما محبت مشفق بر جان ما محنت ما راحت ما درد ما درمان ما

مضمون اور طرز ادا دونوں ایک ہیں۔ اسی مضمون کو مولانا روم نے یوں ادا کیا ہے۔

مرحبا ای عشق خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علتہائے ما

غالب:- شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

غنی کشمیری:- بگوشم ایں صدا از مقری تسبیح می آید
کہ صد دل مضطرب گردد چو یک دل یابد آرامے

غالب کے شعر میں جاندار ٹکڑا ۔ "بیک کف بردن صد دل" ہے
درد ہی غنی کے بیان سے لیا گیا ہے۔

غالب کہتا ہے :- دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

یہ مصرع کے اس شعر سے لیا گیا ہے :-

یا وفا خود نبود در عالم یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

غالب :- میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

عالی شیرازی :- خواستم آتش دلرا بہ نشانم بہ سرشک
آنقدر ہم جگرم سوختہ ام آب نداشت

دونوں خیال بہ ظاہر جدا ہیں ۔ مگر انداز بیان اور مقصد دونوں ایک ہیں

غالب :- بقدر شوق مے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

علی سرہندی :- تو چوں ساقی درد تنگ ظرفی نمی ماند
بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحل ہا

بجز ایک آدھ لفظ کے اور کوئی کمی بیشی خیالات میں نہیں ہوئی۔

غالب کا نہایت سادہ نازک مشہور شعر ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غنی :- ہر کس نہ شناسندۂ راز ست وگرنہ
اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست

مگو کہ نغمہ سرایان عشق خاموش اند کہ نغمہ نازک اصحاب پنبہ در گوش اند

ممکن ہے کہ دونوں شعر جدا سمجھے جائیں مگر غور کرنے پر ذوق سلیم ایک ہی طرف رہبری کرتا ہے۔ دوسرا شعر بھی ویسا ہی ہے۔

غالب :- بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
کب میسر ہے ہر انساں کو بھی انساں ہونا

عالمگیر :- آنچہ بر جستیم کم دیدیم و بسیار است و نیست
نیست جز انساں درین عالم کہ بسیار است و نیست

شعر کی جان غالب کا دوسرا مصرع اور اس کا انداز بیان ہے۔ مگر عالمگیر کے یہاں دونوں مصرعے برابر کے ہیں اور دونوں کے انداز بیان میں بھی فرق نہیں ہے۔

غالب :- کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حافظ :- آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

خیال دونوں کا یکساں ہے۔ غالب کے یہاں زود پشیماں ہے۔ اور حافظ کے یہاں دل نرم۔ غالب کے یہاں جفا سے توبہ۔ حافظ کے یہاں بہر ثواب نماز آمدۂ ۔

غالب :- دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

ناطق مکرانی :- لذت از زخم بسکہ دل زار من گرفت
ناخن زدم بسینہ اگر بہ شدن گرفت

جو کچھ میں لکھتا آرہا ہوں اس موضوع کے خلاف ایک مزیدار بات سنئے ۔ غالب نے ناطق مکرانی کے شعر سے استفادہ کیا یا نہیں کیا مگر حضرت شاد لکھنوی پیرو میر مرحوم نے تو کمال ہی کر دیا سنئے

کوئی دم راحت جنوں کے ہاتھ سے پائیں گے کیا

زخم بھر جائیں گے تو ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا
حال عاشق اُن کو سننے کا مزا ہے اس قدر
ہم کہے جائیں گے جتنا وہ کہے جائینگے کیا
میرے سر آنکھوں پہ بیٹھیں حضرت ناصح جو آئیں
پر جو میں سمجھوں نا وہ پھر مجھکو سمجھائینگے کیا
فاقہ مستی ہے یہی اے شاد تو شل کباب
فاقہ مستی میں سوائے داغ ہم کھائینگے کیا

غالباً غالب کے ان مضامین کے شعر سب کو یاد ہوں گے لکھنا بے سود ہے اسی بحر اور اسی قافیہ میں دیکھئے

غالب :- آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

عرفی :- منم آن سیر زجاں گشتہ کہ با تیغ و کفن
تا درخانۂ جلاد غسل خواں رفتم

عرفی کے یہاں غسل خواں رفتم والا ٹکڑا اس قیامت کا ہے کہ جواب ہی نہیں۔

غالب :- ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

سعدی :- سعدیا حب وطن گرچہ حدیثیست صحیح
نتواں مرد بہ سختی کہ من اینجا زادم

یہاں خیال بالکل ایک ہے۔ گو ظاہر الفاظ میں فرق بھی ہو مگر موضوع مضمون سے باہر نہیں ہے۔

غالب :- ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

شیخ شرف الدین نیشاپوری :- بیم از دشنام و امید وعدۂ کہ من
از ذوق وعدۂ تو بفردا نمی رسم

میلی نے کہا تھا کہ تو وعدہ کر اور ایفائے وعدہ کا خیال ہی نکر ادھر تو نے وعدہ کیا اور ادھر خوشی سے ہمارا دم نکلا بالکل یہی خیال غالب کے یہاں ہے مگر میلی کے یہاں قبل وعدہ ہے اور یہاں بعد وعدہ۔

غالب :- ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

لا اعلم :- غرقۂ بحریم مارا در دیار ما مپرس
لقمۂ کام نہنگیم از مزار ما مپرس

غالب کے شعر میں جان خیال یہی بات ہے کہ دریا میں ڈوب جاتے نہ تو جنازہ اُٹھتا نہ مزار بنتا۔ دوسرے شعر میں بھی یہی ہے۔ مگر غالب کے یہاں حسرت غرق ہے اور فارسی شعر میں اخبار بعد الغرق

غالب :- دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ملا غنیمت :- ز مہرش سینہ ہا جولانگہ برق
دل ہر ذرہ در جوش انا الشرق

ذرہ اور قطرہ۔ انا البحر۔ اور انا الشرق میں کوئی فرق ظاہر نہیں ہوتا

غالب :- بلائے جان ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

لا اعلم :- ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اگرچہ الفاظ ظاہر میں فرق ہے مگر مضمون دونوں ایک ہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب نے زیادہ صراحت سے کام لیا ہے:-

غالب :- بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھرائے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

عرفی :- وقت عرفی خوش کہ نکشودند چوں در برخش
بر در نکشودہ ساکن شد در دیگر نزد

غالب کہتے ہیں کہ بندگی اور زہد و طاعت گذاری میں بھی ہم آزاد ہیں اگر کعبہ کا دروازہ بھی نہ کھلا تو واپس آگئے۔ عرفی کا خیال ہے کہ در دوست نہ کھلا تو اسی بند دروازہ کے پاس ٹھہر گئے۔ مگر دوسرے دروازہ پر نہیں گئے۔ تقریباً ایک خیال دوسرے خیال کی ضد ہے۔

غالب :- گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

بیدل :- دل شوریدۂ ما شور امکاں در نظر دارد
گہر دزدیدہ اینجا زبانِ موج دریا را

تقریباً ایک مضمون ہے جسمیں کوئی خاص فرق سوائے زبان کے نہیں ہے۔

غالب :- ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں
کرے تھے ہر بن مو کام چشم بینا کا

فیضی :- در ہر بن مو کہ مے نہی گوش
فوارۂ فیض اوست در جوش

غالب کا خیال ہے کہ ہر بن مو چشم بینا بنگیا ہے مگر میں ابتک محرم حسن نہیں ہوا۔ فیضی کہتا ہے کہ ہر بال ایک فوارۂ جوشان فیض الٰہی ہے بنائے اشتراک خیال بن مو پر رکھی گئی ہے۔

غالب :- میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

بیگی دختر امیر علی جلائر :- میں اگر توبہ زمے کردہ ام اے سرو سہی
تو خود ایں توبہ نکردی کہ مرا مے نہ دہی

شیخ علی حزیں :- چہ شد از توبہ اگر دامن خشکے داریم
پیش ابر کرم پیر مغاں اینہمہ نیست

بجنسہ خیال بیگی کے شعر سے ملتا ہے۔ رہا علی حزیں کا شعر وہ بھی کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ غور کرنے پر اُسی منزل پر جا پہونچتا ہے۔

غالب :- مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

عمر خیام مے خوردن من نہ از برائے طرب است
نے بہر فساد و ترک دین ادب است
خواہم کہ بیخودی برآرم نفسے مے خوردن دوست بودنم زیں سبب است

یہ کہنا بیکار سی بات ہے کہ دونوں مضمون ایک ہیں۔ مگر یہ لکھنا ضروری ہے کہ یہ مضمون عمر خیام کا خاص مضمون ہے جو اکثر اُن کی رباعیوں سے ظاہر ہوتا ہے

غالب :- مرنے کی ایدل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایان دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

فیضی :- آں شکارم من کہ ہم لایق بہ کشتن نیستم
شرم مے آید مرا از انکس کہ صیاد من است

بنائے خیال دونوں شعروں میں یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ فیضی کہتا ہے میں ایسا شکار ہوں کہ مار ڈالنے کے قابل نہیں ہوں اسیوجہ سے مجھے اپنے صیاد سے شرم آتی ہے۔ غالب بھی یہی کہتے ہیں کہ میں اس کے لائق نہیں کہ وہ مجھکو ہلاک کرے لہذا کوئی اور تدبیر کرنی چاہیئے

غالب :- ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

عرفی :- از من بگیر عبرت و کسب ہنر مکن
با بخت خود عداوت ہفت آسمان مخواہ

ہنرمندی پر آسمان کا دشمن ہونا دونوں شعروں میں موجود ہے یہی بنائے اشتراک خیال ہے۔

غالب :- پوچھتے وہ ہیں کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

عالی :- زمردم یاری پرسید کہ عالی کیستی طالع ہیں
کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسید اینجا

اگرچہ پہلا مصرع بالکل ملتا جلتا ہے۔ مگر مضمون بالکل عام اور ہیں پا افتادہ ہے۔ جو ہر شخص کے ذہن میں آسکتا ہے

غالب :- کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

گرد فشاندند حریفان بزم عشق برخاک ریز جرعۂ مرد آزمائے ما
مے مرد افگن۔ اور جرعۂ مرد آزما مشارکت خیال کا سبب ہیں۔ اور خیال بھی تقریباً یکساں ہیں۔ مرزا فاخر مکیں کا بھی یہی مضمون ہے

زان سیر تان در جہاں را خبر کنید ساقی گرفت جرعۂ مرد آزمائے ما

غالب :- چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

خسرو :- خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند
آرے آرے میکند با خلق و عالم کار نیست

خیال عام اور معمولی ہیں۔ مگر اتنے قریب ہیں کہ جدائی مشکل ہے۔

غالب :- گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

عرفی :- نہ کوہی ز عطا بود و عشق مے داند
کہ بر کرشمۂ ما تنگ بود خلعت طور

عرفی نے کہا تھا کہ ہمپر جو برق تجلی طور نہیں گری تو یہ عطا کی کوتاہی نہیں تھی عشق کو یہ راز معلوم ہے کہ ہمارے جسم پر خلعت طور تنگ تھی یعنی وہ ہمارے قابل نہ تھی۔ غالب کے یہاں خیال اس سے گھٹا ہوا ہے وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ طور پر برق تجلی کیوں گری ہمپر گرتی۔

غالب :- یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زبان اور

خسرو :- زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمیدانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

دوسرے مصرعوں میں ایک قسم کا فرق ہے خسرو کا مصرع نہایت چست ہے اگرچہ غالب کا بھی فلسفیانہ انداز کا نہایت کامیاب مصرع ہے۔

غالب :- صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر
تغیر آب بر جا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

بیدل :- در طبیعت فسردہ صفاہا کدورت است
آئینہ میکند ہمہ زنگار آب را

دونوں شعر الجھے ہوئے ہیں سلجھائے تو ماحصل ایک نکلے گا۔

غالب :- نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا داغ زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

بیدل :- منزل عیش تو وحشت کدۂ امکان نیست
چمن از سایۂ گل پشت پلنگ است اینجا

در وحشت این بزم بہ عشرت نتوان زیست
ہر چند چراغش کنی پشت پلنگ است

غالب کہتے ہیں کہ :- عیش وجاہ سے وحشت کا سدباب نہ ہو سکا۔ زمرد کا داغ بھی میرے لئے داغ پلنگ یعنی سرمایۂ وحشت بن گیا۔ بیدل کہتا ہے کہ وحشت کدۂ عالم میں یہ صلاحیت نہیں کہ منزل عیش بن سکے چمن سایۂ گل سے پشت پلنگ بنگیا ہے۔ دوسرے شعر کا مضمون یہ ہے کہ اس بزم میں جس قدر عشرت کا سامان کروگے باعث وحشت ہوتا جائیگا۔ اور چراغان میں پشت پلنگ کا جلوہ نظر آئے گا۔

غالب :- فلک سے ہمکو عیش رفتہ کا کیا تقاضا ہے
متاع بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

نظیری :- نقدے کہ دوراں بردہ است ازکیسۂ عمر برون
جاوید مستغنی شوم ارصد دہد گر نیسم را

بنائے خیال رہزن سے متاع بردہ کی اُمید واپسی پر مبنی ہے جو دونوں شعروں میں موجود ہے۔

غالب :- نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگادے خانۂ آئینہ میں روے نگار آتش

شیخ علی حزیں :- کتان طاقتم را پردہ داری مے کند خنش
رخش در شام خط ماہ سحاب آلودہ را ماند

غالب کا خیال ہے کہ آئینہ کے خس جوہر کو اُس کے سبزۂ خط سے طراوت پہونچی رہتی ہے دگر نہ میرے معشوق کا چہرہ خانۂ آئینہ میں آگ لگا دے۔ شیخ علی حزین کا خیال تھا کہ میرے کتان صبر کی پردہ داری اس کا خس کرتا ہے خط جو اسکے رخسارہ کو ڈھانک رہا ہے وہ ایک سحاب ہے جسکی وجہ سے میرے کتان صبر پر اس چاند کا پورا اثر نہیں پڑسکتا ورنہ اگر یہ سحاب اسپر نہ ہو تو کتان صبر پارہ پارہ ہوجائے۔ اس شعر میں پرواز خیال یکساں ہے مضمون میں کچھ نہ کچھ فرق ہے :-

غالب :- پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

شیخ علی حزیں :- گر انجاں تر ز شبنم نیست جسم ناتوان من
اگر مے بود با من روے گرمی آفتابش را

غالب کا خیال ظاہر ہے شیخ کا خیال ہے کہ میرا جسم ناتواں شبنم سے زیادہ تو گرانجاں ہے نہیں کہ وہ مجھ پر نظر عنایت کرے اور فنا ہوجائے

صائب کہتا ہے :- بہ اندک روئے گرمی پشت بر گل میکند شبنم
چرا در آشنائی اینقدر کس بیوفا باشد

آفتاب کی تھوڑی سی توجہ میں شبنم پھول پر لات مار دیتی ہے۔ بڑا افسوس ہے آشنائی اور پھر یہ بیوفائی۔

غالب :- کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

خسرو :- زہے عمر دراز عاشقان گر
شب ہجران حساب عمر گیرند

دونوں شعر ایک ہی مضمون کے ہیں کیا فرق کیا جائے۔ البتہ مندرجہ ذیل خیال کچھ شاید علیحدہ ہے

سہری مدینۃ السادات :- ز خضر عمر فزونست عشقباز انرا
اگر ز عمر شمارند شام ہجراں را

غالب :- قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

بیدل :- آنجا جواب نامۂ عاشق تغافل است
یعنی وہ انتظار خبر سے کشیم ما

مضمون دونوں ایک سا ہیں مگر عام مضمون ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ بغیر پہلا شعر دیکھے ہوئے دوسرا شعر کہا گیا ہو۔

غالب :- اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
نکتۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

خاقانی :- من و بلائے تو نطع ادیم و تاب سہیل
من و جفائے تو شاگرد و سیلی استاد

ظہیر فاریابی :- صد بھلائے عشق را کے بوالہوس دارد قبول
کے مشقناسد طفل قدر سیلی استاد را

غالب کے یہاں بصورت عمومیت۔ خاقانی کے یہاں بصورت خصوصیت ظہیر کے یہاں بصورت نفی ایک ہی مضمون کو باندھا گیا ہے بنائے اشتراک خیال سیلی استاد کے کچھ نہیں ہے۔

غالب :- سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

خسرو :- اے گل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند
آنروز ہا کہ در تہ گردوں نہاں شدند

عمر خیام :- ہر سبزہ کہ بر کنار جوے رستہ است
گویا ز لب فرشتہ خوے رستہ است

یا برگ سبزہ تا نخواری ندہی کاں سبزہ ز خاک ماہروئی رستہ است

اگرچہ خسرو کے یہاں کچھ تفاوت کے ساتھ کہا گیا ہے۔ مگر در اصل یہ مضمون عمر خیام کا حصہ ہے جو ادنےٰ تغیر کے ساتھ متعدد مرتبہ کہا گیا ہے۔

غالب :- میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں

عالی شیرازی :- آب و رنگ گلستان عشق اکنوں از نست
عندلیباں ہر چہ میگویند مضمون از نست

دونوں مضمون تقریباً یکساں ہیں۔ عالی کے یہاں دبستاں نہیں ہے مگر اس کے نہ ہونے سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

غالب :- وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

عرفی :- بہ کیش برہمناں آنکس از شہیدانست
کہ در عبادت بت روے بر زمیں نیرد

دونوں کی بنائے خیال وفاداری پر مبنی ہے مضمون قریب قریب ایک ہے

غالب :- جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

عرفی :- ز فروغ آفتابم چو دنبر کہ سیہ
چو دوزلف نست یکساں شب و زدم از سیاہی

دونوں شعروں کی بنا اس مضمون پر ہے کہ سیہ نصیبی کی وجہ سے ہمارے یہاں دن رات یکساں ہے۔

غالب :- بساط ہجر میں تنہا ایک دل کی قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ انداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

فیضی :- دریاب کہ ماند ست ز دل قطرۂ خونے
آن قطرہ ہم از دست تو بسریز چکیدن

مضمون دونوں کا تقریباً ایک ہی ہے۔ کوئی خاص بات قابل تفریق نہیں۔ میر عبدالجلیل بلگرامی نے ایک عجیب طریقہ سے دل کو آمادۂ چکیدن بنایا ہے، ایک رقعہ خاصہ کی تعریف میں کہتے ہیں۔

مرا رسید بینی گاہ و بیگاہ چو قطرہ دل دہ برائے چکیدن

غالب :- مے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام وا نگوں وہ بھی

مولانا جامی :- آسمان جام نگوں دان کزے عشرت تہی است
جستن مے از تہی ساغر نشان ابلہی است

تقریباً ایک مضمون ہے چند الفاظ کی کمی وبیشی پر ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

غالب :- مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

از مکرمش ناف زمین ناف غزال است مشکیں زچہ شد ورنہ لباس حرم آیا

خاقانی :- ناف زمیں است کعبہ مگر ناف مشک شد
کاندر سموم کرد اثر مشک اذفرش

نافہ آہو شدست ناف زمیں از رضا عقدۂ دیبگرست پیکر باغ از ہوا

خیال کی جان اتنی سی بات ہے کہ کعبہ ناف زمین ہے اور وہ ناف غزال ہوگیا۔ یہی غالب کے یہاں ہے اور یہی خاقانی کے یہاں

غالب :- کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

خاقانی امروز کم خورا ندہ فردا چہ دانی آنکہ
ایام قفل بر در فردا بر افگند

خیال صرف اتنا سا مشترک ہے کہ آج کل کا غم نہ کرنا چاہئے۔ مگر اسمیں خاقانی کا خیال بہت ہی ارفع واعلیٰ ہے

غالب :- دل سے ٹھنا ترے انگشت حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

خاقانی :- وصل تو بے ہجر تواں دید نے
گوشت جدا کے شود از استخواں

خاقانی کا پہلا مصرع اس مفہوم کا ہے کہ تیرا وصل بغیر ہجر ناممکن ہے دوسرا مصرع تمثیلی بالکل ایک ہے۔

غالب :- کہلتا کسی یہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

نظیری :- راز دیرینہ زرخ پردہ برانداخت دریغ
حال من شمہ بانشاد غزل کرد دریغ

تقریباً دونوں مضمون ایک ہیں۔ کوئی خاص فرق نہیں ہے

غالب :- ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

مینائے مے از تندیٔ ایں مے بگدازد پیغام غمت در خور تحویل صبا نیست

اصل خیال یہ ہے کہ شیشہ شراب کی گرمی سے پگھل گیا' یہ دونوں میں موجود ہے۔

غالب :- سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ایسے ہی موقع پر سعدی لکھتے ہیں :-

رہ عقل جز پیچ بر پیچ نیست برعارفاں جز خدا ہیچ نیست
تواں گفتن این با حقایق شناس ولے خوردہ گیرند اہل قیاس
کہ پس آسمان و زمیں چیستند بنی آدم و دام و دد کیستند

گو الفاظ نہیں ملتے لیکن خیال بالکل ملجاتا ہے۔ اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے

غالب :- جلا دے لڑتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

لا اعلم :- بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را مے شناسم

خیال عام سا ہے۔ لیکن مشابہت کی وجہ سے لکھدیا گیا

غالب :- اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

فسونی تبریزی :- با دجودیکہ سم آسودہ میشوم از دور
ندیدہ حال مرا دقت بیقراری حیف

غالب کے یہاں یہ خیال نہایت عمدگی سے ادا ہوا ہے مگر خیال ایک ہے فسونی کہتا ہے کہ میں جب اُس کو دیکھتا ہوں آسودہ ہو جاتا ہوں وہ مجھے اچھا اور تندرست جانتا ہے۔ غالب کے یہاں برعکس ہے

غالب :- غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

نظیری درخور اگر نئیم مے لالہ فام را
اے کاش ترکنند ببوے مشام را

اگرچہ خیال عام ہے۔ مگر مشابہت ضرور ہے

غالب :- تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز خالی ہے
اگر پہلوتہی کیجئے تو جا میری بھی خالی ہے

بیدل زجیب ہر مژہ آغوش میچکد اینجا
کہ جائے تو ہمہ در چشم مردماں خالی است

ظاہرا دونوں خیال جدا معلوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے پر دماغ ایک ہی نتیجہ پر پہونچتا ہے۔

غالب :- بہت دنوں میں تغافل نے تیری پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

ظہوری :- تو نظر باز نۂ ورنہ تغافل نگہ است
تو سخن فہم نۂ ورنہ خموشی راز است

مشابہت یہ ہے کہ دونوں نے تغافل کو نگاہ مانا ہے :-

غالب :- زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہمیں فریب
کہ بن کہے ہی ہمیں سب خبر ہے کیا کہئے

میلی ہروی :- دارد خموش تا من حسرت کشیدہ را
گوید شنیدہ ہم سخن ناشنیدہ را

دونوں شعر کے خیالات بالکل ایک ہیں اور دونوں جگہ نہایت دلکشی سے ادا ہوئے ہیں

غالب :- زبسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے
کشاد و بست مژہ سیلیٔ ندامت ہے

بیدل :- دیدہ را کہ بنظارۂ دل محرم نیست
مژدہ بر ہم زدن از دست ملامت کم نیست

دونوں خیال ایک دوسرے کی ضد ہیں مگر مژہ بر ہم زدن دونوں کے یہاں سیلیِ ملامت مانا گیا ہے اور اصل خیال یہی ہے۔

غالب :- پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

عرفی :- بیار بادہ کہ جانم دمے زنالہ برآید
ہزار زمزمہ از دل بیک ترانہ برآید

خیال عام ضرور ہے۔ مگر دونوں میں مشابہت پوری پوری موجود ہے

غالب :- نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے جسکو کہ دلکشا کہئے

علی سرہندی :- سرت گردم بزن تیغ دورے بروئے دل بکشا
دلم تنگ است کار از زخم پیکاں برنمی آید

اسیطرح ناصر علی نے اس مضمون کو یوں بھی کہا ہے

اے زتیرت جستہ از چشم غزالاں خوابہا
سینہ را از تیغ بیداد تو فتح البابہا

غالب نے اپنے کسی خط میں لکھا ہے کہ زخم تیغ کو دلکشا کہنا میرا ایجاد کردہ مضمون ہے۔ مگر سرہندی اور ناصر علی کے شعر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کو غالب سے پہلے ظاہر کیا جا چکا ہے:۔

غالب:۔ تا کجا اے آگہی رنگ تماشا باختن
چشم وا گردیدہ آغوش وداع جلوہ ہے

بیدل:۔ چشم وا کردن کفیل فرصت نظارہ نیست
پرتو ایں شمع آغوش وداع محفل است

غالب کہتے ہیں کہ اے آگہی دیکھنے کو دیکھنا نہ سمجھ بلکہ دیدہ وا شدہ وہ آغوش ہے جو وداع کے وقت کھولی جاتی ہے۔ بیدل کا خیال ہے کہ آنکھ کھولنا فرصت نظارہ کا کفیل نہیں بلکہ اس شمع کا پرتو وداع محفل کے لیے آغوش وا شدہ ہے۔

غالب:۔ کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

لا علم:۔ سیہ بختیاں قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آبحیواں تشنہ می آرد سکندر را

دونوں عالم خیال ہیں چونکہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں صرف اسلیے لکھے گئے ہیں۔

غالب:۔ باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

عالی شیرازی:۔ کشد چو سوے چمن بے قدت جمال مرا
گزد چو مار سیہ سایۂ نہال مرا

مولانا حالی نے اس شعر کو مضمون غالب کا ہم مضمون بتایا ہے جو ذیل میں درج ہے۔ مگر در اصل وہ نہیں ہے بلکہ جو اوپر لکھا گیا ہے وہ ہم مضمون ہے۔

نظیری:۔ بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نوا گران نخوردہ گزند را چہ خبر

ذوق:۔ سایۂ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے
اژدہا بن بن کے شب اے رشک گلشن آپ میں

غالب:۔ اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

عرفی حلہ ہا سوختہ اند اہل بہشت از غیرت
تا شہیدان تو گلگوں کفنے ساختہ اند

دونوں خیالوں کی یکسانیت ظاہر ہے کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے

غالب:۔ بیان کس سے ہو ظلمت گستری میرے خرابے کی
شب مہ ہو جو رکھدیں پنبہ دیوار زنداں کے روزن میں

خاقانی:۔ آں اسیر تیرہ روز ستم کہ عمرے در جہاں
آفتاب از روزن دیوار زنداں دیدہ ام

غالب پنبہ کو شب مہ۔ اور خاقانی روزن دیوار زنداں کو آفتاب کہتا ہے عنوان بیان ملتا جلتا ہے۔

غالب:۔ در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
اینکہ من نمے میرم ہم زناتوانیہاست

بیگی دختر امیر علی جلائر:۔ جاں بہ لب از ضعف نتواند رسید
ما بزور ناتوانی زندہ ایم

مومن :- ابتو مرجانا بھی مشکل ہی ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

خیالات میں کوئی فرق قابل بیان نہیں معلوم ہوتا ایک دوسرے کا چربہ ہے۔

غالب :- بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی ؎

میلی ہروی :- زبیخودی شدہ ام محو گریہ مے خواہم
کہ ہر چہ مے شنوی ناشنیدہ انگاری

میلی کہتا ہے میں جنوں میں بک رہا ہوں جو تو نے اوسکو نہ سنا ہوا سمجھنا

غالب :- زبانیہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

خاقانی :- زیں نام چو تر کنم زباں را
صد بوسہ دہد لبم زباں را

بالکل ایک خیال ہیں بلکہ خاقانی کے یہاں بہت بہتر ہے

غالب :- چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

غیاثی استرآبادی :- نامت زرشک پیش کسے چوں نمی برم
آیا سراغ از کہ کنم منزل ترا

بالکل ایک خیال ہے۔ کوئی فرق قابل بیان نہیں معلوم ہوتا۔

غالب :- بیخود بوقت ذبح طپیدن گناہ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

بیجرم عذر جرم نگفتن گناہ من با صد گنہ قصاص نکردن گناہ کیست

اس شعر میں صرف انداز بیان ملتا ہے مضمون دونوں علحدہ علحدہ ہیں

اس قدر شعر غالباً کچھ کم نہیں ہیں جنسے ہمارے پاس اس جملہ کی توثیق ہوتی ہے کہ غالب کے تواردسے اگر لوگ فخر کرسکتے ہیں تو وہ کس قدر ہیں اب ہم اساتذہ اردو کے شعر لکھتے ہیں جو غالب سے بہت پہلے گزرے ہیں ملاحظہ ہو۔

غالب :- کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا ؎

یاسمن :- یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اگر کوئی فرق ہے تو صرف اس قدر کہ غالب کے شعر کو زیادہ اسکی شرح کہہ سکتے ہیں ورنہ اور کچھ نہیں۔

غالب :- دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میر :- عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نچھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا

دونوں کے خیالات پامال اور فرسودہ ہیں مگر یکسانیت ضرور ہے۔

غالب :- یہ لاش بے کفن اسد خستہ جان کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ذوق :- کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

غالب اور ذوق دونوں نے ایک ہی بات کہی ہے صرف دونوں کا انداز بیان دیکھئے باقی خیالات کو نظر انداز کر دیجئے

غالب :- ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

میر ممنوں :- تفاوت قامت یار اور قیامت میں ہے کیا ممنوں
وہی فتنہ ہے لیکن یہاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

غالب :- موسم گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
خوب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

سودا :- زباں ہی شکوہ میں قاصر شکستہ بالی کے
کہ جسنے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

نیاے خیال بے پروائی کے شکریہ پر ہے۔ جو دونوں شعروں میں موجود ہے مضمون بھی قریب قریب ایک ہی ہے

غالب :- ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

میر درد :- خلعت دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل
حسن برائے چشم ہے نغمہ وبال گوش ہے

مفہوم دونوں کا تقریباً ایک ہے پہلے مصرع میں کچھ تباین ہے جو قابل توجہ نہیں۔

غالب :- نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خواجہ حسن اللہ بیاں :- عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آسکتی نہیں
رحم آتا ہے بیاں اب مجھکو اپنی آہ پر

دونوں مضمونوں میں سوائے چند لفظوں کے تغیر کے کوئی فرق نہیں ہے

غالب :- عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو منظور تکو نامی فرہاد نہیں

انعام اللہ خاں یقین :- ندیتا عیش کی خسرو کو فرصت قصر شیریں میں
جو میں ہوتا تو جاے شیر جوے خوں رواں کرتا

طرز ادا میں فرق ہے مگر مفہوم دونوں کا وہی رشک رقابت پر ختم ہوتا ہے

میر :- مت ڈھلک مژگاں سے میرے اے سرشک آبدار
مفت ہی جاتی رہیگی تیری موتی کی سی آب

غالب :- توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

مضمون دونوں تقریباً ایک ہیں مگر غالب کا انداز بیان نہایت چست اور مصرع اولیٰ بہت ہی اعلیٰ ہے۔

غالب :- ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

میر :- منتظر قتل کے وعدہ کا ہے اپنے یعنی
جیتا مرنے کے لئے ہے یہ گنہ کار ہنوز

دونوں شعروں کی بنائے خیال استبعاد پر ہے کہ ہم مرنے کے لئے زندہ ہیں

غالب :- ہمنے مانا کہ تغافل نکروگے لیکن
خاک ہو جائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک

میر :- بالیں پہ میرے گھر سے وہ روے گا جب تلک
کر جاؤں گا سفر ہی میں دنیا سے تب تلک

خواجہ میر درد :- کی تو تھی تاثیر آہ آتشیں نے اُس کو بھی
جب تلک پہونچے ہی پہونچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

غالب اور میر درد اور میر کے شعروں میں کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا مفہوم سب کا یکساں ہے۔ الفاظ جدا جدا ہیں۔

غالب :- ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

دونوں شعر یکساں ہیں کوئی خاص بات ایسی نہیں جو قابل اظہار ہو

غالب :- نظر لگے نہ کہیں اُس کے دستِ بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

میر :- سراہا اُن نے ترا ہاتھ جس نے دیکھا زخم
شہید ہوں میں ترے تیغ کے لگانے کا

مفہوم دونوں شعروں کا یکساں ہے۔ الفاظ و زبان مختلف ہیں

غالب :- آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

میر :- سر سے باندھا ہے کفن عشق میں تیرے یعنی
جمع ہم نے بھی کیا ہے سر و ساماں یکجا

غالب کا شعر میر کے شعر سے بہت چست ہے۔ اور مضمون میں بھی کچھ تھوڑا سا فرق ہے۔

غالب :- قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

میر حسن :- گرچہ دل کو ہے یقین خط تو نہیں لکھنے کا وہ
پر تقاضہ شوق کا لکھنے سے کب رہتا ہے باز

غالب :- ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

سودا :- بہ تمنائے جبیں بدر بھی ہوتا ہے ہلال
بسکہ یاں سجدے کے مشتاق ہیں اربابِ کمال

بنائے خیال دونوں شعروں میں یہ ہے کہ بدر تیرے آستاں پر ناصیہ سائی کی تمنا میں ہلال ہو جاتا ہے۔

غالب :- ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

آبرو :- آبرو کے قتل کو حاضر ہوئے کس کر کمر
قتل کرنے کو چلے عاشق پہ تہمت باندھ کر

دھمکاؤ تے ہو ہمکو عبث باندھ کر کمر — کھولوں ابھی تو جائے میاں کا بھرم نکل

آبرو کے پہلے شعر میں ایہام ہے لفظ تہمت میں جس سے شعر نہایت ہی لطیف ہو گیا ہے۔

اس قدر شعر نمونتاً لکھے گئے ہیں ورنہ بہت سے شعر متقدمین کے ایسے ہیں جن کے لکھنے کے لئے مجھکو ایک مستقل مضمون کی ضرورت پڑے گی اب اسکو ختم کر کے چند شعر معاصرین کے بھی لکھتا ہوں۔

غالب :- ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

آزردہ :- ہیں تو احباب فراہم نہ ہو ساماں طرب
بزم ماتم تو ہے گو انجمن سعد نہیں

بجز الفاظ کے دونوں شعروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بالکل ایک ہیں

غالب :- دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا

ذوق :- ذکر کچھ چاک جگر سینے کا سُن سن اپنے
دیکھ کر زخم کو میں دیکھوں ہوں ناخن اپنے

اگرچہ غالب کے یہاں نہایت چستی سے یہ مضمون بندھا ہے مگر اس سے کیونکر انکار کیا جائے کہ مضمون ایک ہی ہے۔

غالب :- نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

ذوق :- وہ ہوں میں رہ نورد شوق میرے ساتھ جاتا ہے
بر نگ سایۂ مرغ ہوا نقش قدم میرا

بات ایک ہی ہے فرق صرف یہ ہے کہ غالب نقش قدم کو جبار، موج رفتار اور ذوق سایہ مرغ ہوا بتاتے ہیں۔

غالب :- ہم مریض عشق کے تیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

ذوق :- بیمار عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج
کہہ تو ہی اے مسیح کہ پھر تیرا کیا علاج

غالب :- منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزول بتاں انداز و ادا میرے بعد

آتش :- ہو گیا سلسلہ مہر و محبت برہم
نازنیں بھول گئے ناز و ادا میرے بعد

غالب :- آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

ذوق :- تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے

ذوق :- غالب کے شعر میں کوئی فرق نہیں۔ آتش اور غالب کے شعر میں صرف الفاظ کا فرق ہے۔ مومن کے شعر میں شب ہجر۔ اور غالب کے یہاں اس کا بدل عشق ہے۔

غالب :- کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
مرتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھکر

شیفتہ :- کس توقع پہ جیئں شیفتہ مایوس کرم
غیر پر بھی ستم یار کی افواہیں ہیں

مقصد ایک ہے صرف انداز بیان میں کچھ فرق ہے۔

غالب :- یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

ذوق :- کیا اعتبار ہستی ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

اگرچہ غالب کا شعر انتہائی بلیغ ہے۔ مگر شعر ذوق سے علیحدہ نہیں ہے

غالب :- غم ہستی کا اسدکس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

آغا جان عیش :- اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ تمثال اور مفہوم دونوں شعروں کا ایک ہی ہے

غالب :- آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

شیفتہ :- آتے ہیں شکوہ کی جا شکر ستم کر آیا
کیا کروں ہائے ارادے سوز بیباکی کے

غالب کے یہاں فکر قبل از وقوع واقعہ۔ اور شیفتہ کے یہاں فکر بعد وقوع واقعہ ہے۔ اور کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔

غالب :- ہیں اور صد ہزار نوا ہائے جانخراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

ذوق :- ہاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

غالب کے یہاں نہ شنیدن۔ اور ذوق کے یہاں شنیدن و خموشی صرف اسی قدر فرق ہے خیال ایک ہے

غالب :- جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

مومن :- اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

طرز بیان میں چونکہ دونوں مشاق ہیں اس لئے فرق معلوم ہوتا ہے ورنہ مآل ایک ہی ہے۔

غالب:- قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مومن:- چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی
واعظ یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

غالب:- مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

ذوق:- مے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم
کہ آخر جب اُسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا

ایک ادنیٰ سا فرق ہے اور کچھ نہیں۔ ذوق کے یہاں ذکر بعد الواقعہ غالب کے یہاں فکر قبل الواقعہ۔

غالب:- عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی

شیفتہ:- عشق ذلت ہے تو ذلت ہی سہی
میری ذلت تری عزت ہی سہی

انداز بیان یکساں ہے۔ مضمون نا قابل تقابل ہے اگرچہ یکساں ہو

غالب گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مومن:- کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

غالب کے یہاں پہلے مصرعہ میں ایک کلیہ دوسرے میں واقعہ۔ مومن کے یہاں دونوں مصرعوں میں واقعہ ہے یہی فرق ہے۔

غالب:- تے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

ناسخ:- شکل نظر نہیں پڑی آیا نہیں پیام بھی
برسوں ہوئے کہ ایک سی حالت چشم و گوش ہے

غالب:- خوب تھا ہوتے جو پہلے سے ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

مومن:- مانگا کرینگے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

دونوں خیال بالکل یکساں ہیں طرز ادا اور الفاظ میں البتہ فرق ہے مگر چست دونوں ہیں۔

غالب:- قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

عارف شاگرد غالب:- نہ خداوند کو گر پاک و منزہ سمجھوں
کب گوارا ہو مجھے تیرا نگہباں ہونا

حاصل خیال یہ ہے کہ تو ایسا نہیں ہے کہ میرا رشک تجھے خدا کو سونپنے دے

غالب:- نفرت کا گمان گزرے ہے میں رشک سے گذرا
کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

مومن:- تمانوں گا نصیحت پر نہ سنتا ہیں تو کیا کرتا
کہ ہر اک بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

اصل خیال یہ ہے کہ تمہارا نام ایسا نہیں ہے کہ اس کو نہ سنا جائے انداز بیان جداگانہ ہیں۔

غالب:- چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

آتش:- قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے ترے
خط دیا لیکن نہ بتلایا نشان کوئے دوست

اگرچہ دونوں نئے نئے عنوان سے بیان ہوئے ہیں مگر اصل خیال یہ ہے کہ دوسروں کے سامنے ہم تیرا نام نہیں لے سکتے۔ پہلے ہی لکھا جاچکا ہے کہ معاصرین کے خیالات بہت سے غالب سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لئے جس قدر خیالات جمع کرکے لکھے گئے وہ ایک خرد بیں نظر کے سامنے کم نہیں ٹھہر سکتے۔ اور میں مضمون کو زیادہ طویل نہیں لکھنا چاہتا اس واسطے یہیں ختم کرتا ہوں۔ اب وہ حصہ باقی رہجاتا ہے جن میں غالب نے بار بار اپنے ہی خیالات کا اعادہ کیا ہے۔ مگر وہ دو قسم کے خیالات ہیں ایک قسم وہ جسمیں انھوں نے اپنے خیالات فارسی کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اور دوسرے وہ جسمیں خود اپنے ہی اردو کلام سے فائدہ اٹھایا ہے مگر کوئی سوال کرے کہ وہ کس قدر ہیں تو میں کوئی صحیح جواب دینے سے مجبور ہوجاؤں گا۔ میں چاہتا تھا کہ فارسی کے ترجموں کو بالکل چھوڑ دوں۔ مگر اس خیال میں کچھ استقلال پیدا نہیں ہوا۔ لہذا پانچ چھ شعر نمونہ کے لئے لکھے دیتا ہوں:-

غالب:- سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

خود را ہمی بہ نقش طرازی علم کنم تا با تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم

غالب:- ہم ہیں اور افسردگی کی آرزو غالب دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

گردہم شرح تمنائے عزیزاں غالب رسم امید ہمانا زجہاں برخیزد

غالب:- مشکین لباس کعبہ علی کے قدم سے جاں
ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

غالب:- از مکر تمش ناف زمین ناف غزال ست
مشکین زچہ شد ورنہ لباس حرم آیا

غالب:- بے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا
بخوں غلطیدن صد رنگ دعوئ پارسائی کا

خستہ عجزیم و از ما جز گنہ مقبول نیست تکیہ دارد بر شکست توبہ استغفار ما

غالب:- زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت میتوان گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

غالب:- ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملی داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش آنروز کہ وقت باز پرس آید پیش
بگزار مرا کہ من خیالے دارم یا حسرت عیشہائے ناکردہ خویش

یہ خیال کچھ مرزا غالب کے اس قدر دلنشین ہوگیا تھا۔ کہ انھوں نے بار بار اس کا اعادہ کیا ہے چنانچہ مثنوی ابر گہربار میں بھی اسکا اعادہ کیا ہے۔

میں اسیقدر لکھکر مضمون کو ختم کرتا ہوں چونکہ اردو کے تکرار خیالات کے لئے مستقل مضمون چاہیئے لہذا اسپر کسی دوسرے وقت روشنی ڈالونگا بہت ممکن ہے کہ بعض حضرات اشعار مذکورہ میں الفاظ سے دھوکہ کھاکر شرحیں پیش کریں۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا ہوسکتا ہے مگر میں نے جس خیال کی بنا پر دو خیالوں کو یکساں ٹھہرایا ہے اسکو دفع کرنے کی بھی کوشش کریں۔ ورنہ یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ ہر شعر کے لفظ جدا ہیں۔ بہرحال یہ ایک سعی ہے جو پیش کیجاتی ہے۔ اور وہ بھی محض ایک دوست کے اس اصرار پر کہ غالب کا ہر خیال نیا ہے اور اس کے خیال بلند کی جگہ پر کسی دماغ کی رسائی نہیں۔ شاید اب اُن کی سمجھ میں آجائے۔ میرے عزیز دوست کو یاد رکھنا چاہیئے کہ فن شاعری ایک ایسا فن ہے کہ اس میں کوئی بڑے سے بڑا شخص اپنے ذاتی اچھوتے خیالات پیش نہیں کرسکتا

چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے بقول شخصے ؎ یک چراغ است درین بزم کہ از پرتو آن ۔ ہر کجائے بزمے انجمنے ساختہ اند۔

"آرگس"

چنگاری

(فسانہ)

اس میں شک نہیں کہ یوسف سخت مادہ پرست، بے انتہا سطحیات پسند اور ضرورت سے زیادہ جامد انسان تھا۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ قوت تنقید اسکی نہایت زبردست تھی۔ اور اگر وہ دنیا اور اس کے کاروبار کو ہمیشہ صرف ڈوا اور دُو کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھتا بلکہ کبھی کبھی وہ سطح سے گذر کر عمق تک بھی پہونچ جایا کرتا تو اس میں کلام نہیں کہ وہ نہایت اچھا نقاد ثابت ہوتا۔ شعر و شاعری سے اسے مطلقاً کوئی لگاؤ نہ تھا۔ لیکن جب وہ اپنے اصول کے لحاظ سے اسپر اظہار رائے کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ شاید وہ ایک حد تک صحیح کہہ رہا ہے۔

ایک دن آئینہ سامنے لئے بیٹھا تھا کہ دفعتہً کھڑا ہو گیا اور بولا کہ یوں تو میرے والدین کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں، لیکن ایک ظلم انھوں نے اتنا بڑا مجھ پر کیا ہے کہ میں شاید عمر بھر اُسے معاف نہیں کر سکتا۔ فرض کیجئے کہ آپ کو کسی چیز سے نفرت ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے آپ پر لازم کر دیجائے تو آپ کو دیوانہ ہو جانا چاہئے یا نہیں۔ ذرا میری صورت کو ملاحظہ کیجئے اور اسی کے ساتھ میرے نام (یوسف) پر غور کیجئے کیا اس سے زیادہ ملعون مثال مبالغہ کی اور کوئی ہو سکتی ہے۔

جس وقت کوئی میرا نام لیکر پکارتا ہے تو فوراً والدین کی یہ شاعری میرے سامنے آجاتی ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ کوئی نہایت مکروہ چیز میرے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے اور ہر شخص میرا نام لیکر گویا مجھے بدصورتی کا طعن دیا کرتا ہے۔"

وہ اپنے افکار کے لحاظ سے نہایت سادہ انسان تھا اور چاہتا تھا کہ ہر چیز کو اسی سادگی سے دیکھے جیسی وہ نظر آتی ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ سطح سے گذر کر عمق کی طرف بڑھنا فطرت کی توہین ہے کیونکہ جس حقیقت کو اُس نے ہم سے چھپایا ہے اس کا احترام ہم پر واجب ہے اور اُس کو بے نقاب کرنا اپنے حدود سے بڑھ جانا ہے۔ وہ کہا کرتا کہ اگر آسمان نیلا نظر آتا ہے، تو اسے نیلا ہی کہو، اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ حقیقتاً نگاہ کا دھوکا ہے، نظر کا فریب ہے۔ علی الخصوص اُس وقت جب کہ ہماری کوئی غرض اُس سے وابستہ نہیں، تحقیق و تفتیش کے مفاد و نتائج کا وہ قایل ضرور تھا، لیکن اسی حد تک کہ خود اپنے استنباط و استقرار سے وہ کسی نتیجہ تک پہونچے، دوسرے کی مسلمات پر وہ خود اپنا کوئی نظریہ قائم نہیں کرتا تھا۔ وہ اُس کو ایسا ہی ناجائز سمجھتا تھا جیسے کسی اور کی ڈالی ہوئی بنیاد پر کوئی شخص اپنی عمارت طیار کرے حالانکہ اسے بالکل علم حاصل نہیں ہے کہ یہ بنیاد کس حد تک مستحکم ہے اور کس نوع کی عمارت کی متحمل ہو سکتی ہے۔

اس کا خیال تھا کہ دنیا میں ہر شخص ایک جداگانہ کام کے لئے پیدا ہوا ہے اور یہ وضعی اختلاف کسی تدبیر سے دور نہیں ہو سکتا اور نہ ایک انسان کو اپنے ان حدود سے متجاوز ہونا چاہئے جو فطرت کی طرف سے مقرر ہیں۔ اسی لئے وہ سب سے زیادہ جن جماعتوں سے متنفر تھا ان میں

پہلا درجہ اُس نے حکما، و فیلسوف کا رکھا تھا اور دوسرا شعرا کا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر دنیا ان دونوں جماعتوں سے خالی ہو جائے تو پھر نہ کوئی فساد پیدا ہو سکتا ہے اور نہ عالم میں مکر و فریب کی اشاعت ہو سکتی ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی امن و سکون نام تھا صرف دماغ کی سادگی کا اور اخلاق کی بلندی صرف۔ راست گوئی کا اور زبان کا وجود صرف اس لئے ہے کہ وہ ذہن کے سادہ اور اکات کو چند ضروری الفاظ سے بغیر کسی فضول اضافہ کے ظاہر کر دے۔ شعرا میں صرف میر ہی ایک ایسا خوش نصیب شاعر تھا جس کے ذکر کو وہ سن لیتا تھا اور غالب کا نام لینا تو اس کے سامنے کفر تھا۔ وہ کہا کرتا کہ "سر پنجۂ مژگان آہو" کی حقیقت پر غور کرنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ میں اپنی بھینس کے لئے خود اپنے ہاتھ سے بھوسہ طیار کرنے میں وقت صرف کروں یہاں تک خیر کوئی مضایقہ نہیں کہ

چلا نہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی میں اُس کی گلی سے پکار لایا تھا

ایسا ہوتا ہے، ہو سکتا ہے اور محبت کی اس کیفیت کو نہایت سادہ اور بالکل ضروری الفاظ سے ظاہر کر دیا ہے، لیکن ہوائے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل سے کیا معنے؟ اگر صرف سیر گل کافی ثبوت بے مہری کا ہو سکتا ہے تو دنیا کا ہر شخص بے مہر قاتل ہے اور اگر ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ قاتل کی سیر گل صرف بے مہری کی بنا پر ہے تو اس کا ثبوت کیا الغرض وہ شاعرانہ مفروضات کا سخت دشمن تھا اور خصوصیت کے ساتھ وہ شاعری جس میں صرف واویلا اور گریہ و زاری ہوتی، اسے نہایت مکروہ سمجھتا۔ کیونکہ وہ ایسی شاعری کو قوائے عمل کا دشمن سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ کی صحبت کا لطف میں کبھی نہ بھولونگا۔ یوسف اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا چند ضروری خطوط دیکھ رہا تھا کہ ایک شاعر جو یوسف سے بھی بے تکلف تھے مجھ سے ملنے کے لئے وہاں آ گئے۔ دوران گفتگو میں انھوں نے اپنا ایک شعر سنایا جس میں "خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو" ذرا مختلف انداز سے بیان کیا گیا تھا۔ یہ شعر سنتے ہی یوسف نے خطوں کو علیحدہ رکھ کر شاعر صاحب کی صورت کو غور سے دیکھا اور بولا کہ "معاف فرمائیے، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ غذا کس ملک کے انسانوں کی ہے اور کیا ایک درندہ کی طرح خون پینے والا اور کچا جگر چبانے والا آدمی دعوائے محبت بھی کر سکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے محبوب نے آپ کا یہ شعر سنا ہے یا نہیں، لیکن اگر اب تک وہاں نہیں پہونچا ہے تو مہربانی فرما کر اسے اپنی طرف منسوب نہ کیجئے ورنہ ممکن ہے آپ کو کسی حدیقۂ حیوانات میں پہونچا دے۔ اور اگر اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ کی غذا بالکل ترک ہو گئی ہے تو بھی اس کا کیونکر کسی کو یقین آ سکتا ہے جبکہ پورے ساڑھے سولہ انچ کا کالر آپ کی گردن کے لئے اب بھی درکار ہوتا ہے۔

تعلیم کے لحاظ سے وہ ایک جامع شخص تھا اور تمام فنون متداولہ میں فاضلانہ آگاہی رکھتا تھا، چونکہ اس کے والد خود عربی فارسی کے عالم تھے اس لئے انھوں نے سب سے پہلے یوسف کو وہی پڑھایا جو خود انھوں نے پڑھا تھا اور پھر اس کے بعد انگریزی شروع کرائی جس وقت وہ فلسفہ کا بی اے ہو کر کالج سے نکلا تو لوگوں کو سخت حیرت ہوئی کہ اس جیسے سطحی ذہن انسان نے کیسے فلسفہ کی گہرائیوں

سے دلچسپی پیدا کی، اور کیوں اس نے اس موضوع کو اپنے لئے انتخاب کیا، بعض نے جب اس سے اس کا سبب دریافت کیا، تو اُس نے جواب دیا کہ دنیا کے پاس سب سے بڑا ذریعہ حقیقتوں کو پوشیدہ کرنے کا فلسفہ ہے اور میں نے اسی لئے قصد کرکے اس کا مطالعہ کرنا چاہا تھا کہ اگر کوئی خامی میرے عقاید حیات میں باقی رہ گئی ہے تو وہ بھی نکل جائے، کیونکہ میرے خلاف جو بڑے سے بڑا حربہ فلسفہ کا استعمال کیا جا سکتا تھا اس کی حقیقت کو بھی میں نے معلوم کر لیا اور آج اپنے آپ کو میں اپنے عقاید دیرینہ پر اور زیادہ راسخ العہد پاتا ہوں"

شادی کی نسبت اس کا خیال تھا کہ اس کا تعلق انسان کی ذات سے نہیں بلکہ ہیئت اجتماعی سے ہے اور اس لئے وہ کہا کرتا تھا کہ بیوی وہی ہے جسے والدین اپنے خاندان کے مصالح کے لحاظ سے منتخب کریں اور چونکہ اس کے والدین مر چکے تھے اور گھر میں اب وہی تنہا رہ گیا تھا اس لئے اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ ایک تنہا انسان کو بیوی کی کیا ضرورت ہے۔

جایداد کافی تھی اور کاشت کا شوق اسے فطری تھا۔ اس لئے اس کے شب و روز ایک کسان کی طرح بسر ہوتے تھے اور وہ صرف اس خیال سے مسرور تھا کہ اس کی دولت سے گانوں کے بہت سے مویشی، مزدور اور کاشتکار فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور ان کے درمیان وہ ایسی زندگی بسر کر رہا ہے جسمیں دماغ پر کسی قسم کا زور ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جسوقت رات کو وہ الاؤ کے سامنے بیٹھ جاتا اور گانوں کے بہت سے معصوم انسان اس کے چاروں طرف جمع ہو کر نہایت سادہ قسم کی باتیں کیا کرتے تو وہ بہت خوش ہوتا اور سمجھتا کہ دن بھر کی محنت کا ماحصل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایک زمانہ اسی طرح گذر گیا، یہانتک کہ یوسف نہایت ہی سخت قسم کا دہقانی ہو کر رہ گیا، اور خیالات نے اس کی وضع ظاہری کو بھی بدل دیا بھدا سادہ بھاتی جوتا پانوں میں، اگاڑھے کا کُرتہ جسم میں اور موٹی مارکین کا صافہ سر پر، مونچھ داڑھی الجھی ہوئی، سر کے بال پریشان یہ تھی حالت یوسف کی جو دولت کے لحاظ سے ایک تعلقہ دار، اور علم کے لحاظ سے ایک فاضل اجل کی حیثیت رکھتا تھا۔

(۲)

مس ہلن عہد مغلیہ کے فنون لطیفہ سے کس حد تک ماہر تھیں اس کا صحیح علم تو شاید کلکتہ یونیورسٹی کے اُنھیں طلبہ کو ہوگا جہاں وہ اس موضوع پر لکچر دینے کے لئے فرانس سے بلائی گئی تھیں، لیکن یہ حقیقت اب ہر ذی علم طبقہ پر روشن ہو چکی تھی کہ دماغ انسانی اور فنون لطیفہ کے درمیان خود مس ہلن کا وجود یقیناً ایک نہایت ہی اہم کڑی تھا۔

اُس کی تقریر سے کوئی شخص فنون لطیفہ کی ماہیت سمجھ سکتا یا نہیں، یہ امر تو مشتبہ ہو سکتا تھا، لیکن اس کے خط و خال، اس کی رعنائی شباب، اس کی تکمیل حسن اُس کی خوش ادائیوں کے ساتھ تمام وہ کیفیات جو نفسیاتی اصول کے ماتحت نفسانی لذت و نشاط کا سامان فراہم کر سکتی ہیں، اس درجہ مکمل طور پر اس کے اندر موجود تھیں کہ برسوں کے لکچر ایک طرف اور چند لمحوں کے لئے اس کا سامنے آجانا ایکطرف وہ خود فنون لطیفہ میں سے ایک ایک چیز کی اس قدر تکمیل کے ساتھ حامل تھی کہ مشکل سے کوئی دوسرا پیکر اس قدر جامع نظر آسکتا ہے

اس کے چہرہ کے خطوط یہ معلوم ہوتا تھا کہ فطرت ابھی ابھی کسی تازہ نقاشی کی فکر سے فارغ ہوئی ہے اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی ہر جنبش ایک بدیعۂ موسیقی پیدا کرتی محسوس ہوتی تھی۔ یقیناً وہ ایک شعر تھی متحرک، ایک نغمہ تھی ذی حیات، ایک رقص تھی مسلسل، اور ایک بہار تھی بے پایاں گفتگو میں اسکی لبوں کی حرکت گویا نسیم فردوس سے دو ملفوف پنکھڑیوں کا جنبش میں آجانا تھا اور جنبش لب کے ساتھ اس کی آواز گویا موج کوثر و تسنیم کا چل نکلنا۔

ہرچند مس ہلن کو آئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا، لیکن وہ ایسا پھول نہ تھی جس کی شگفتگی کو کلکتہ یونیورسٹی کی چار دیواری چھپانے میں کامیاب ہوجاتی۔ اس کی نکہت منتشر ہوئی اور اس حد تک ایک عالم اس کا آشفتہ ہوکر رہ گیا۔ مس ہلن کی ایک اور خصوصیت جو اس کے حسن ظاہری اور کمالات علمی سے زیادہ تباہ کن تھی اس کا ذوق سلیم تھا۔ اس میں صرف فضل و کمال کی سنجیدگی ہی نہ پائی جاتی تھی۔ بلکہ اس کے تصور و خیال میں بھی فطرت نے اس قدر بلند پاکیزگی ودیعت کردی تھی کہ مشکل ہی سے وہ کسی وقت اس سطح پر دیکھی جاتی تھی جہاں ہو نچکر ایک عورت اپنے آپ کو لطف کے لئے تو پیش کرسکتی ہے لیکن کوئی دردِ پرستش پیدا نہیں کرسکتی۔ اس کا قول تھا کہ اگر عورت زمین کی کوئی چیز ہے تو اس کو کسی نہایت ہی عمیق سمندر کا موتی ہونا چاہئے اور اگر وہ آسمان کی پیداوار ہے تو پھر اس فضائے بسیط کا وہ بعید ترین ستارہ ہونا چاہئے جس کی صرف ہلکی سی جھلملاہٹ کبھی کبھی اہل دنیا کو نظر آسکے۔ وہ کہا کرتی کہ عورت کے لئے پردہ ضروری ہے لیکن چہرہ و جسم کا نہیں کیونکہ یہ خود اس کا ظاہری ملبوس ہے، بلکہ اسکی فطرت کا جو بے نقاب ہونے کے بعد مرد کی سانس سے داغدار ہوکر بہت جلد مرجھا جاتی ہے۔ پھر اس کی یہ باتیں صرف زبانی ادعا نہ تھا بلکہ وہ حقیقتاً اس پر عامل بھی تھی اور یہی خاص سبب تھا کہ اس کی طرف سے لوگوں میں غیر معمولی بے چینیاں پیدا ہوگئی تھیں۔

جس وقت یوسف کو اُس کے دوست پروفیسر حبیب کا خط ملا کہ وہ چند دن کے لئے محض تفریح و سیاحت کے لئے مع مس ہلن کے اس کے پاس آرہا ہے تو وہ بہت گھبرایا کہ خبر حبیب تک تو کوئی مضایقہ نہ تھا لیکن یہ مس ہلن کیا معمہ تھی لیکن چونکہ حبیب اس کا نہایت ہی عزیز دوست تھا اس لئے وہ انکار تو نہ کرسکتا تھا۔ تاہم اس نے یہ اطلاع دیدی کہ اگر میں تمہارے شریک سفر کے ذوق کے لحاظ سے کوئی انتظام نہ کرسکوں تو مجھے الزام نہ دینا، کیونکہ ایک دہقان سے وہ رکھ رکھاؤ ناممکن ہے جو ایک مغربی خاتون کے لئے ضروری ہے حبیب نے جواب دیا کہ وہ شہر کو چھوڑ کر گانوں اس لئے نہیں آنا چاہتیں کہ شہر کو اپنے ساتھ لیجائیں بلکہ وہ تو یہاں کی دہقانی ہی زندگی کا تجربہ کرنے آرہی ہیں۔ تاہم یوسف نے گانوں کی پرانی گڑھی جو اس کے خاندان کے قبضہ میں صدیوں سے چلی آرہی تھی اور لب آب واقع ہونے کے لحاظ سے بہت لطف کی جگہ تھی، صاف کرا کے اُس میں ضروری سامان اُن کے آسائش کا فراہم کردیا۔

پروفیسر حبیب، یوسف کے ساتھیوں میں تھے اور اُن لوگوں میں سے جو یوسف کی سادہ فطرت سے ایک بچہ کی طرح الفت رکھتے تھے۔ حبیب بے انتہا سنجیدہ انسان تھا اور مشکل ہی سے کوئی بات اُس سے خراج تبسم حاصل کرسکتی تھی، لیکن یوسف کا اُس کے پاس ہونا اُس کے لئے یکسر نشاط

دانبساط ہوا کرتا تھا، اور جب اس کو فلسفہ و تاریخ کے عمیق مطالعہ کے بعد تفریح کی ضرورت ہوتی تو یوسف کے پاس آجاتا اور چھیڑ چھیڑ کر اُسکی باتیں سُنا کرتا۔

پروفیسر حبیب اور مس ہلن کی ملاقات اول اول "ٹگور" کے شانتی نکتان میں ہوئی تھی جب ایک مرتبہ سالانہ اجتماع کے موقع پر یہ دونوں بھی وہاں مدعو ہوئے تھے۔ مس ہلن کا ذکر تو حبیب اس سے قبل بھی سن چکا تھا لیکن چونکہ وہ خود بڑی حد تک دشوار پسند طبیعت رکھتا تھا اس لئے اس کے اندر کوئی خاص جستجو پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب جو شانتی نکتان میں اس سے تعارف ہوا تو وہ اس کے سحر جمال سے اس قدر متاثر نہیں ہوا جتنا یہ معلوم کر کے کہ مس ہلن ایک عورت سے زیادہ شاعرہ اور ایک شاعرہ سے زیادہ معبودہ تھی۔ حبیب کے ایک دوست نے جب اُسکی رائے مس ہلن کے متعلق دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ "میں ابھی تک کوئی صحیح رائے مس ہلن کے متعلق قائم نہیں کر سکا کیونکہ وہ ایک ایسی تیتری ہے جو ہنوز ریشم کے خول سے باہر نہیں آئی اور جس کے صحیح خط و خال کی نسبت کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کی فطرت جس "عورت" کو اس کے اندر طیار کر رہی ہے، وہ ایک ایسا دُرِ خوش آب ہے جس کے لئے فرق شاہانہ کی ضرورت ہے۔"

اُس کے بعد رفتہ رفتہ حبیب کے جذبات نے جو صورت اختیار کی وہ بہت زیادہ سنجیدہ تھی۔ یعنی یہ بات اب زیادہ شہرت پزیر ہو چلی تھی کہ حبیب مس ہلن کے ساتھ شادی کرنے کے خواہشمند ہیں اور غالباً یہ بھی کہ مس ہلن ان کی اس خواہش کو گوارا کر رہی ہیں۔

(۳)

مہمانوں کو خلد آباد آئے ہوئے دو دن گزر چکے ہیں۔ شام کا وقت ہے، حبیب مس ہلن اور یوسف باہر کے صحن میں جہاں سے دریا سامنے نظر آتا تھا، بیٹھے ہوئے گفتگو میں مصروف ہیں۔ حبیب پہلے ہی یوسف کی خصوصیات سے مس ہلن کو آگاہ کر چکا تھا لیکن اب تو خود اس نے بھی اس کا کافی مطالعہ کر لیا تھا اور وہ اس کی معصومیت سے خاص دلچسپی لینے لگی تھی۔ اور جب یوسف موجود ہوتا تو وہ قصداً ایسی گفتگو کرتی کہ یوسف کو زیادہ اختلاف کا موقع ملے۔

افق میں سنہرے بادلوں کے انعکاس سے فضا زرافشاں ہو رہی تھی، دریا کی لہریں ایسی نظر آتی تھیں جیسے پانی میں کسی نے بادلہ اور مقیش کتر کے منتشر کر دئے ہوں۔ موسم پر گفتگو ہو رہی تھی کہ دفعتہً مس ہلن نے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے مغرب اور مشرق کی شاعری کا مطالعہ یقیناً کافی کیا ہوگا کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟" یوسف کچھ دیر خاموش رہا اور اس کے بعد بولا "وہی فرق ہے جو مجھ میں آپ میں ہے۔" مس ہلن مسکرائی اور بولی "یعنی مغرب کی شاعری میں نسائیت زاید ہے، یہ مدعا ہے آپ کا؟" یوسف "میرا مدعا کچھ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ مختصر سے مختصر فقرہ میں آپ کے سوال کا جواب دیدوں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے شاعری سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں ہے اور اس قسم کے جذبات جن کو نسائیت، موسیقیت، شعریت وغیرہ عجیب و غریب الفاظ سے ظاہر کیا جاتا ہے، میری فہم کے حدود سے بالا یا فروتر ہیں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ مغرب کی شاعری میں نسائیت ہے یا نہیں جب کہ شروع سے نسائیت کا مفہوم ہی

ہی میرے ذہن میں نہیں آیا۔

مس ہلن نے اس انداز سے جس طرح وہ کسی بچہ کو درس دے رہی ہو پہلو کی میز سے ایک زریں نقش و نگار کا گلاس اُٹھا لیا اور یوسف کو دکھا کر بولی کہ "آپ اس کے نقوش دیکھتے ہیں اور ان کی بابت کیا رائے ہے؟"

یوسف :۔ صرف یہ کہ بنانے والے کے پاس وقت ضائع کرنے کے لئے وقت کی کمی نہ تھی، کیونکہ پانی پینے کا مقصود تو ایک سادہ گلاس سے بھی حاصل ہو سکتا ہے اور یہ بھی آپ کی رعایت سے، ورنہ میرے نزدیک تو میرا مٹی کا پیالہ ان سب سے بہتر ہے۔"

مس ہلن اس جواب کو سنکر ہنسی، لیکن اس کی ہنسی میں انبساط سے زیادہ انقباض اور نشاط سے زیادہ ناکامی کی الجھن شامل تھی۔ وہ یہاں صرف تبدیل آب و ہوا کے لئے آئی تھی، لیکن یوسف سے ملنے کے بعد اس نے ایک ایسی عجیب و غریب ہستی اپنے سامنے پائی کہ اس کا غائر مطالعہ کرنے کے لئے وہ مجبور ہو گئی اور جوں جوں اس کا مطالعہ زیادہ وسیع ہوتا گیا، وہ یہ محسوس کرنے لگی کہ کوئی چیز یوسف میں ایسی موجود ہے جو اسپر غالب ہوتی چلی جا رہی ہے اور یہ یقیناً اس کی زندگی کا سب سے پہلا تجربہ تھا۔ اس وقت تک دنیا والوں نے جس انداز سے اُسکی پزیرائی کی تھی، وہ عجز و فتادگی کے سوا اور کچھ نہ تھا اس لئے اُسکو یقین ہو گیا تھا کہ دنیا کو میرے ہی خیال کا محکوم ہونا چاہیئے، لیکن جب اُس نے یوسف کو دیکھا، جو نہ اُس کے حسن و جمال سے متاثر ہوتا نظر آتا تھا، نہ اس کی پاکیزگی ذوق و خیال سے، تو اس کو ایک قسم کا صدمہ پہونچا۔

عورت اپنے دماغی نشو و نما کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، لیکن جس وقت اس کے بیدار کو شکست ہونے لگتی ہے تو وہ اس سطح پر آجانے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے جہاں وہ اکثر ناکام ثابت ہوتی ہے اور اس کی ناکامی مرد کی کامیابی ہوا کرتی ہے۔ لیکن اگر وہ اس طرح کامیاب ہو جائے تو اُس کے بعد اس کی پرواز کی بلندی کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور پھر مرد کے لئے کوئی چارہ کار سوائے اس کے نہیں ہوتا کہ وہ یا تو فرشتہ ہو کر رہ جائے، یا شیطان بنکر دنیا میں آفت برپا کر دے۔

مس ہلن، جو ضرورت سے زیادہ ذہین تھی اور ہر بات اپنے ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتی تھی جب یوسف کی سطحی باتوں پر غور کرتی تو ان میں بہت زیادہ گہرائی محسوس کرتی اور اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیوں حبیب نے اس قدر غلط تعارف اس کا کرایا تھا۔ اور جب اس کا یہ خیال زیادہ قوی ہو جاتا تو حبیب کی اس نارسائی ذہن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگتی۔ اُسے یوسف کے ساتھ اس وقت تک کوئی لگاؤ پیدا نہ ہوا تھا اور نہ اس کی کوئی وجہ ہو سکتی تھی، کیونکہ سوائے شباب کے یوسف کے پاس کوئی اور چیز ایسی نہ تھی جسے وہ ہدیتہً کسی عورت کے سامنے پیش کر سکتا، اور مس ہلن اس سے بہت بلند تھی کہ محض کسی کا شباب اُس کو متاثر کر سکے۔ اس لئے زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ اُسے لگاؤ پیدا ہو گئی تھی اور ایک قسم کا حریفانہ رشک محسوس کرتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ یوسف بھی اسی کے سامنے جھک جائے اُس کی بلندیٔ ذوق کو حیرت کی نگاہ سے دیکھے، اُس کے خیال سے اپنے زندگی کے ہر لمحہ کو معمور کر دے اور پھر اُس کے بعد وہ ایک پامال و مغلوب شکار کی طرح اس کی درماندگی کے مطالعہ سے لطف اُٹھائے اور چونکہ یوسف کی سنگدلی اس باب میں اس کا بالکل پہلا تلخ تجربہ تھا، اس لئے

ہر ناکامی کے بعد اس کی ضد بڑھتی جاتی تھی اور اس کی ہر ضد بالکل غیر محسوس طور پر اُسے اُس سطح پر آہستہ آہستہ لا رہی تھی جہاں پہونچنے کے بعد ایک عورت کی نازک کلائی خواہ مخواہ کسی مضبوط گرفت کی آرزومند ہو جاتی ہے

وہ یہاں صرف ایک ہفتہ کے لئے آئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ خلد آباد کی صحیح آب و ہوا سے اپنے دماغ کو تازہ کر کے پھر کلکتہ واپس چلی جائے گی، لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ یہاں آکر اس کا دماغ اور زیادہ خستہ ہو جائے گا۔ چونکہ اب وہ یوسف کو شکست دینے کے لئے اپنے ترکش کا ایک ایک تیر استعمال کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اس لئے بلا لحاظ اس کے کہ مصلحت کا اقتضا کیا ہے، اُس نے تار کے ذریعہ سے ایک ماہ کی اجازت اور حاصل کی اور حبیب کو رخصت کر کے تنہا یہاں رہنے پر آمادہ ہو گئی، بہانہ تو صرف یہ تھا کہ آب و ہوا خوشگوار ہے اور وہ ہنوز سیر نہیں ہوئی، لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے جلوت کے نشتروں کو ناکام پا کر اب خلوت کے تیروں سے کام لینا چاہتی تھی۔ اس جیسی ذہین عورت کے لئے خوش اسلوبی کے ساتھ حبیب کو رخصت کر دینا اور یوسف سے مزید قیام کی اجازت حاصل کر لینا چنداں دشوار نہ تھا۔ حبیب چلے گئے اور وہ خلد آباد کی سنسان گڈھی میں ایک خلوت نشین ساحرہ کی طرح اسباب سحر کی طیاری میں مصروف ہو گئی۔

باقی ——— باقی

نیاز فتحپوری

دواخانہ شفائی نظیر آباد لکھنؤ

سفوف اعجاز:۔ صرف نو دن کے استعمال سے تمام ضعیف قوتیں بالکل یقینی طور پر ازسرنو واپس آجاتی ہیں اور انسان حیران رہ جاتا ہے قیمت عہ

حبوب شاہی:۔ اس کی ایک گولی کچھ دیر قبل کھا لیجئے اور پھر دیکھئے کہ دواؤں میں کیا کیا طلسمی اثر چھپے ہوئے ہیں۔ شیشی ۱۲ گولی قیمت عہ

روغن اعجاز:۔ اگر سفوف اعجاز کے ساتھ ۲۱ دن تک اس روغن کا بھی استعمال کر لیا جائے تو پھر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ناقابل بیان ہے صرف اسی روغن کا بھی استعمال بھی اپنی جگہ اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ قیمت عہ

سفوف نادر:۔ یہ سفوف خاص وقت میں ایک مرتبہ استعمال کیا جاتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لطف کیفیت سے غشی کی سی نوبت آجاتی ہے قیمت ۱۲

نمک اعجاز:۔ یہ بالکل نئی ایجاد ہے اور چودہ دن کے استعمال کے بعد ایک شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقتاً جوانی کس چیز کا نام ہے۔ قیمت عہ

الائچی طلسمی:۔ یہ چیز سوائے ہمارے دواخانے کے کہیں نہیں مل سکتی پان میں معمولی الائچی کی طرح استعمال ہوتی ہے اور چودہ دن کے بعد ایک شخص تمام دواؤں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اگر آپ مایوس ہو چکے ہیں تو اُن کو منگا کر استعمال کیجئے قیمت دو روپئے

ملنے کا پتہ

منیجر دواخانہ شفائی نظیر آباد لکھنؤ

لارڈ ریڈنگ کا عہد حکومت

(ملاحظہ ہو "نگار" ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء)

مسلمانوں کا مسئلہ

اس باب میں میں ہندوستان کا زیادہ روشن پہلو پیش کروں گا جس کا مشاہدہ میں نے گزشتہ موسم سرما میں کیا۔ اس کی زراعتی آبادی کے مادی مصائب کا بیان پوری شرح وبسط سے کیا جا چکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس کی شہری آبادی مفتوح قوم کی حیثیت سے اپنی حالتِ زوال پر کس قدر ماتم کناں ہے اور اب صرف یہ دکھانا باقی رہ گیا ہے کہ وہ کونسی بھلائی ہے جو ان کم ہونے والے مصائب کی کسی حد تک تلافی کر رہی ہے۔ انگریزی حکومت کے طرفدار شیخی بگھارا کرتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان میں امن وامان پیدا کر دیا ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ امن شریفانہ نعمت ہے۔ لیکن انگریزی حکومت نے اسے اس سے بڑھکر نعمت عطا کی ہے جسکے کہ بلاشبہ تمام ہندوستان کے شکریہ کی مستحق ہے اور جو بجائے خود ایک قیمتی برکت ہے اس لئے کہ اس میں باقی تمام کھوئی ہوئی چیزوں کو دوبارہ فتح کر لینے کی قوت موجود ہے، وہ یہ ہے کہ انگریزی عہد حکومت نے خیالات کی آزادی عطا کی ہے۔ یہ ایک نئی چیز ہے۔ جو ہندوستان کو اس سے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی اور ممکن ہے کہ انگریزی اثرات کے بغیر کبھی حاصل نہ ہوتی اور یہ ناممکن ہے کہ ایسی چیز کو نعمت سے تعبیر نہ کیا جائے جو فتح کی لعنت کو امید کی برکت میں تبدیل کر دینے کے لئے تقدیر کی گئی ہو +

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو مشرق کو صرف اُس کے دلربا نظاروں کے باعث پسند کرتے ہیں اور میرا جھگڑا یورپ سے اس وجہ سے نہیں ہے کہ اُس نے مشرق میں کیوں تبدیلی پیدا کر دی اس میں کچھ شک نہیں کہ مغربی طریقوں کی حماقت آمیز اور بسا اوقات خود غرضانہ طرز عمل کی وجہ سے ماضی کی بہت سی شریفانہ اور مفید چیزیں تباہ کر دی گئیں ہیں، لیکن میری یہ خواہش نہیں ہے کہ ماضی اپنی مجموعی حیثیت سے واپس آجائے اور نہ مجھے اس کا افسوس ہے کہ وہاں خیالات کے جدید نظام کی تحریک کیوں شروع کی گئی۔ مجھے معلوم ہے کہ وقت پیچھے نہیں لوٹتا اور مجھ سے بڑھکر اور کوئی شخص اس اصول کا قائل نہ ہوگا کہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں جو چیز کہ گزر چکی ہے وہ ہمیشہ کے لئے گزر چکی ہے اور کبھی واپس نہیں آسکتی۔ برخلاف اُس کے مجھے مشرق ومغرب کے باہمی تعلقات میں دونوں کا فائدہ نظر آتا ہے۔ اور اگرچہ اس کی قدیم خوبصورتی سرعت کے ساتھ تباہ ہو رہی ہے اور اس کی رسوم کا قدیم نظام بدلا جا رہا ہے، تاہم میں غیر محدود توقعات کے ساتھ اس جدید دور کی آمد کا انتظار کر رہا ہوں جس کی تعمیر پرانے کھنڈرات پر کیجائیگی۔ بلاشبہ میری یہ خواہش ہے کہ خاص ملکی چیزوں میں جو کچھ بچایا جا سکے بچا لیا جائے اور اُسے از سر نو تعمیر کے کام میں لایا جائے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ جدید عمارت پرانی عمارت سے بہتر بنائی جا سکتی ہے اور مجھے بے انتہا مسرت ہوگی اگر میں اس کی دوبارہ تعمیر میں کچھ حصہ لے سکوں گا

جدید آغاز کی کوئی علامت موجود نہ تھی۔ خیالات ایسے تنگ دائرے میں محدود ہو گئے تھے کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل تھا اور قوم کا بیکار دماغ جو اپنی ذہنی جکڑ بندیوں میں مبتلا تھا، نسلاً بعد نسل کمزور ہو رہا تھا +

ہم اس قسم کے جمود کا انتہائی نتیجہ دوسرے ممالک مثلاً ایشیائے کوچک اور ایران میں دیکھ چکے ہیں اور نیز ان ممالک میں جو ہم سے بہت قریب واقع ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کی بالعموم یہی حالت تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی اقوام کی نشوونما میں قدرتاً ایک ایسی منزل آتی ہے جب کہ اُن کی حالت بالکل خراب ہو جاتی ہے اگر یہی جمود عرصۂ دراز تک جاری رہے تو ایسا معلوم ہوگا کہ بابل کی طرح وہ بالکل مر گئی ہیں اور انکی جگہ خالی پڑی رہ گئی ہے یا زیادہ طاقتور اقوام میں وہ جذب ہو گئی ہیں جیسا کہ اس زمانے کے جاندار اور طاقتور ترکوں میں لاطینی جذب ہو گئے تھے۔ تقریباً ہر حالت میں ذہنی بیداری بیرونی اثرات کا نتیجہ رہی ہے۔ مثلاً یہ کہ ایسی ذہنی بیداری کسی قریب کے ملک میں پائی جاتی ہو جو اپنے ہمسایہ ملک سے زیادہ طاقتور ہو اور اس کا مخالف بھی ہو۔ ایسی حالت میں بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مختلف اقوام کا ایک دوسرے کی ذہنی زندگی پر اثر ڈالنا باہمی ترقی کا قدرتی اور ضروری قانون رہا ہے۔ مثال کے طور پر ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ پر نظر ڈالو تو معلوم ہو جائیگا کہ ان کی جدید ذہنی زندگی کی ابتدا اس حملہ سے ہوئی جو مہذب اور بہادر عربوں نے اسپین میں سے ہو کر کیا۔ اسی طرح کیتھولک گرجا نے اپنے کہنہ اور بوسیدہ نظام کی اصلاح اُسوقت کی جبکہ مغربی ایشیا سے حملے ہونے شروع ہو گئے۔ بعینہٖ یہی عمل ابن حمایی حملہ کی تہ میں کام کر رہا ہے جو گزشتہ سو سال سے یورپ کے وجود کو ایشیا کے لئے باعث خطرہ ثابت کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ایشیا اب مغرب کی فاتح عقل سے واقف ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور اس ذہنی ہتھیار سے فائدہ اُٹھا رہا ہے جو اس کے حریف کی طاقت کا حقیقی راز ہے اور یہ کشمکش سب سے زیادہ ہندوستان میں واقع ہو رہی ہے۔ اپنے طویل خواب غفلت کے بعد ہندوستانی دماغ ہر جگہ بیدار ہو رہا ہے اور ہر روز ان مسائل میں سے نئی باتیں پیدا کر رہا ہے جنمیں پہلے وہ ایسی بُری طرح مقید تھا کہ ہر طرف نا اُمیدی دکھائی دیتی تھی +

اس بیداری کے لئے ہندوستان بلاشبہ انگلستان کا رہین منت ہے مغرب کے ذہنی طریقوں کا اثر سب سے زیادہ ایشیا کے مذاہب پر پڑا ہے۔ قدیم مذہبی مشاغل جس میں فہم و فراست کو کچھ دخل نہ تھا۔ رفتہ رفتہ ایسی قلبی واردات کے لئے جگہ خالی کر رہے ہیں جنکی تسکین محض نقلی حوالوں سے نہیں ہو سکتی۔ اور اب یہ حالت ہے کہ تمام مذاہب کے پیرو اُن اُمور پر عقلاً بحث کرتے ہیں جنھیں سو سال پیشتر وہ محض نقلاً بیان کر دینے پر اکتفا کرتے تھے تقریباً اسی قسم کی کیفیت مغربی ایشیا میں ہر جگہ رونما ہو رہی ہے لیکن ہندوستان میں غالباً وہ بہت نمایاں ہے اور یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ خواہ ہمارے عہد حکومت نے دوسرے فوائد کو نقصان پہونچا دیا ہو تاہم اُس کے مذاہب کو غیر دیدہ و دانستہ اور شاید غیر رضامندانہ طریقہ سے مگر واقعاً اس سے فائدہ پہونچا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ امر غلط معلوم ہوتا ہے تاہم اصلیت یہ ہے کہ اجنبی لوگوں کی دنیوی حکومت نے جنھیں اس بات کا فخر ہے کہ حکومت کا کوئی مقررہ مذہب نہیں ہے مذاہب کی زندگی میں جدید طاقت پیدا کر دی ہے اور انھیں زیادہ

استوار بنیادوں پر قائم کر دیا ہے۔ روحانی عقاید رکھنے والے کو بھی طاقت پہنچی ہے، وحشی بھی اب ایسے مذہب میں اپنی پرورش پاتا ہے جو زندہ ہے اور جو اسپر دن بدن زیادہ نیکی کا اثر ڈالتا رہتا ہے +

ہندوستان میں عام طور پر چار بڑے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ ہندو مذہب جو مختلف شکلوں کے ۴/۵ حصہ آبادی پر مشتمل ہے اسلام جو پنجاب اور بنگال میں بہت زیادہ طاقتور ہے اور جس کے نام لینے والوں کی تعداد ۵ کروڑ ہے۔ کیتھولک عیسائی جو زیادہ تر جنوبی ہند میں پائے جاتے ہیں اور پارسی +

ان میں صرف ہندو مذہب ہی ایسا ہے جو یہاں کا قدیمی مذہب ہے اور جو کلیتہً دیہاتی آبادی کی فطری رجحانات کے عین مطابق ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی سیاح ان اوہام پرستیوں سے متاثر نہ ہو جنپر وہ سختی کے ساتھ کاربند ہیں اور جو گویا اس کی بنیاد ہیں۔ جس جدید معنی میں ہم مذہب کا استعمال کرتے ہیں یعنی اخلاق کا مجموعہ جس کی بنیاد کسی الہامی کتاب پر ہو، اُس معنی میں ہندو مذہب مذہب نہیں ہے بلکہ قدیم یونان اور روما کے عام عقاید کے مانند یہ ایک قسم کی مائی تھولوجی (اصنام پرستی) ہے۔ یہ مذہب قومی اور مقامی ہے۔ وہ بنی نوع انسان کو اپنے دائرہ میں لانے کی کوشش نہیں کرتا یہ حق صرف ہندوستانی اقوام کا ہے کہ وہ ہندو کہلائیں اور جتنی پاکیزگی کے ساتھ ہندوستان میں اسپر عملدرآمد ہو سکتا ہے اتنا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ برہمنوں کی تعلیمات کے مطابق ہندوستان ایک مقدس سرزمین ہے اور دیوتاؤں کے مندر صرف وہیں تعمیر کئے جا سکتے ہیں۔ وہیں انسان مکمل زندگی بسر کر سکتا ہے یا عبادت کے ذریعہ سے روحانی فوائد سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ بعض مقامات خصوصیت سے متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ مقدس ہستیوں کو اپنے پہلو میں رکھتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہاں خدائی اثرات خاص طور پر جلوہ گر ہیں۔ مثلاً قدیم اٹلی کے باغات کی طرح ہندوستان کے تمام دریا مقدس سمجھے جاتے ہیں اور ان کے کناروں پر دیوتاؤں کے مندر تعمیر کئے جاتے ہیں اور روحانی اثرات سے فیض حاصل کیا جاتا ہے +

خوبصورتی کے نقطۂ نظر سے کوئی شے اس قدر حیرت انگیز نہیں ہو سکتی جس قدر کہ ان قدیم مندروں میں ہندوؤں کی عبادت کا نظارہ ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص جوش کا اظہار کئے بغیر اسے نہیں دیکھ سکتا اسی طرح یہ ناممکن ہے کہ وہ جنوبی ہند کے عالیشان مندروں میں لاکھوں ہندوؤں کے مجمع کو سفید لباس میں اپنا سالانہ تہوار مناتے ہوئے دیکھے اور قبل از عیسائیت یورپ کے لوگوں کی حالت کا جدید ہندوستان کی حالت سے موازنہ کرے یا یکسانیتِ تخیل کا اعتراف نہ کرے۔ یہاں بتوں کی عبادت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اندازہ غیر جہاندیدہ انگریز پرانی کتابوں کے مطالعہ سے کر سکتا ہے۔ مدورا اور سرنگم کے مندر اپنی بناوٹ کے اعتبار سے یورپ کی تمام عمارات سے زیادہ حیرت انگیز اور موثر ہیں اور خاص دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ مردہ چیزیں نہیں ہیں۔ اس کے دروازوں میں خریدار اور دکاندار ابھی تک اپنی تجارت میں مصروف ہیں اور پرندے اس کے چھجوں میں اپنا بسیرا رکھتے ہیں۔ متبرک بندر اور متبرک ہاتھی وہاں موجود ہیں۔ پجاری ابھی تک روشن چراغوں کے گرداگرد بیٹھکر اپنے بھجن گایا کرتے ہیں۔ تہواروں کے موقعوں پر پیتل کے بیلوں پر تیل ملا جاتا ہے اور جاتریوں کی پیشانیاں تشقہ سے معطر کی جاتی ہیں۔ دن بھر پھولوں اور لوبان وغیرہ کی خوشبو آتی رہتی ہے۔ مذہب کا یہ کام قدیم الایام سے جوں کا توں چلا آرہا ہے

شاید لوگوں کی مفلسی کے باعث اس میں کچھ کمی آگئی ہو مگر وہ ابھی تک عوام کی روزانہ زندگی کا زندہ جزو بنا ہوا ہے۔ جب میں نے مڈورا کا مندر دیکھا تو اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ میں نے بالآخر بابل کا مندر دیکھ لیا اور سمجھ لیا کہ مصر میں اپیلس[1] کی پرستش کیونکر ہوتی ہوگی۔ دیوتاؤں کی یہ پرستش (نہ کہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم) ہندو مذہب کی بنیاد ہے اور ابھی تک اس کا نمایاں پہلو بنی ہوئی ہے +

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس کے ساتھ ہی زیادہ تربیت یافتہ برہمنوں میں اس بات کا رجحان بڑھتا جاتا ہے کہ عقاید کو روحانی معانی پہنائے جائیں۔ ویدوں کا فلسفہ اعلیٰ ہے اور مذہبی خیالات میں اصلاح کا معیار پیش کرتا ہے اور اگرچہ برہمنی نظام اخلاق کی کسی تحریری کتاب سے معرا ہے تاہم اعلیٰ ترین نظام سے اس کا تطابق کیا جاسکتا ہے اور یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی بہترین تعلیم کے مشابہ ہے مگر..... روایات باپ بیٹے کے تعلقات یا خاوند بیوی کا رشتہ جس قدر ہندوؤں میں شریفانہ اور متبرک سمجھا جاتا ہے اتنا اور کسی مذہب میں نہیں۔ لہٰذا وہ برائیاں جنہیں صدیوں کے ذہنی جمود نے اضافہ کر دیا ہے، اب جبکہ ذہن بیدار ہو گیا ہے کھلم کھلا برائیاں تسلیم کی جارہی ہیں اور روشن خیال جدید برہمن ازخود عیسائیوں کے بہترین اخلاق کا تتبع کر رہے ہیں اور اُسے اپنے نظام میں داخل کرتے جاتے ہیں۔ مذہبی اصلاح کا یہ پہلو مشترکہ ہے۔ ذہنی جمود کے ساتھ قوم میں بُری رسوم بھی آجاتی ہیں اور جب جمود زائل ہونا شروع ہو جاتا ہے تو جس شے نے اُسے اصلاح پر آمادہ کیا ہو، بالعموم اسی کی نقل کیجاتی ہے +

چنانچہ اب ہم جدید برہمنوں کو بے غرضی کے اخلاقی پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ سچائی، انصاف اور صیانت کے بارے میں بھی ان کی تلقین عیسائیوں سے ملتی جلتی ہے وہ بھی ضمیر کو انسان کا بہترین رہنما قرار دیتے ہیں۔ وہ بہترین چیز کو لیکر اپنے یہاں بہترین روایات کے مطابق کر لیتے ہیں +

اس قسم کی تحریکات میں ایک خطرہ یہ ہے کہ غلامانہ نقل کی عادت پڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نسل کے ہندوؤں میں ہم ایک ایسا فریق پاتے ہیں جس کا مطمح نظر یہ ہے کہ یورپ کی پوری پوری تقلید کیجائے۔ ان میں سے صرف چند ہی اشخاص نے عیسائی مذہب اختیار کیا ہے لیکن اکثر اپنے عقاید سے دستبردار ہونے کے بعد فلسفہ کے مختلف فرقوں کے ہم خیال ہو گئے ہیں۔ جو کم و بیش لا مذہب ہیں۔ بعض اگرچہ اپنے تئیں ہندو کہتے ہیں تاہم انھوں نے ذات پات کی قیود سے اپنے تئیں آزاد کر لیا ہے۔ بنگال اور شمالی ہندوستان میں برہمو سماج والوں کی ایک وسیع جماعت پیدا ہو گئی ہے۔ جن کے اصول ان فرقوں سے ذرا ہی مختلف ہیں جو خدا کی ہستی کے قائل ہیں۔ ہندوستان کے جنوبی حصص میں جہاں برہمنوں کا زور ہے، اس قسم کی بدعات بے اثر رہی ہیں اور بجائے اس کے وہاں روایتی عقاید کو معقول بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وشنو اور شیو یا دیگر قومی دیوتاؤں کے پجاریوں میں اتنی طاقت موجود ہے یا نہیں کہ وہ اپنے عقاید کو خیرباد کہے بغیر اخلاقی اصلاح کے انقلاب کو برداشت کر لیں، لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ ان میں اصلاح کی تحریک جاری ہے اور نتیجہ اب تک اس قدر نکلا ہے کہ ہندو سوسائٹی کے لیڈروں نے اپنے مذہبی فرقوں کی

---

[1] APIS ۔ ثور مصریوں کا دیوتا

بہبودی اور معاشرتی ترقی میں دلچسپی لینی شروع کردی ہے اور اس کا اظہار ان کوششوں سے ہوسکتا ہے جو تعلیم پھیلانے مذہبی اوقاف کا بہتر انتظام کرنے، مندروں کو سابقہ حالت میں بحال کرنے، دھرمسنی کی شادی کا سدباب کرنے اور بیواؤں کی شادی کا رواج دینے میں ظاہر کر رہے ہیں +

یہی تحریک پارسیوں میں بھی جاری ہے۔ اگر یہ لوگ ہندوستان کی پولیٹکل زندگی میں نمایاں حصہ نہ لیتے تو انھیں مشکل سے ہندوستانی قرار دیا جا سکتا تھا۔ آبادی کے لحاظ سے وہ نہ ہونے کے برابر ہیں اور صرف ایک ہی جگہ پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں بمبئی ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں وہ زیادہ تعداد میں آباد ہیں۔ لیکن اُن کی دولت، اُن کی تجارتی حوصلہ مندی اور ہر قسم کی تعلیم سے مستفید ہونے کی خواہش نے انھیں نہایت بارسوخ اور اہم درجہ عطا کر دیا ہے۔ یہ لوگ ایران کے آتش پرستوں کی اولاد ہیں اور ابھی تک قدیم روایات پر قائم۔ مذہب زرتشت ابتدا میں سادہ اور فلسفیانہ تھا۔ مگر ان دیگر مذاہب کی طرح جو ہندوستان میں آئے ہیں، اس میں بھی کھوٹ اور خراب رسوم شامل ہوگئی ہیں اور اس نے ان بہت سے اوہام باطل کو اختیار کر لیا ہے جو ہندوستان کے لئے مخصوص ہیں۔ اُن میں سے بعض تو وہ ہیں جو ان کے پہلی مرتبہ آباد ہونے کے موقع پر ہندو راجاؤں نے ان سے زبردستی قبول کروائے تھے اور بعض اس عام جہالت کا نتیجہ ہیں جو سیاسی حالات کے باعث پیدا ہوگئی تھی۔ بہرحال پارسیوں نے سب سے پہلے اس ذہنی آزادی سے فائدہ اُٹھایا جو انگریزی حکومت کا طغرائے امتیاز رہی ہے اور چونکہ وہ تجارت پیشہ ہیں اس لئے موجودہ زمانہ کے تجارتی دور سے انھوں نے دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ فائدہ اُٹھایا ہے اور اب وہ خاصے مالدار ہوگئے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور با اخلاق ہونے اور قدرتاً نیکی کی جانب رجوع ہونے کا یہ اثر ہے کہ اب وہ پھر اپنے مذہب کی قدیم سادگی کو زندہ کرنا چاہتے ہیں اور ہندوؤں سے کہیں زیادہ ان میں یہ خواہش پیدا ہوگئی ہے کہ اپنے عقاید کو روحانی معانی پہنائیں اور اپنے رسوم و رواج کی اصلاح کریں۔ جس شخص کو کبھی کسی تعلیم یافتہ پارسی کے ساتھ "برج خموشاں" میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اُس نے اندازہ کیا ہوگا کہ وہ اپنے مُردوں کو کھلا رکھنے کی قدیم رسم کی تشریح کس فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں پارسیوں اور جنوبی ہند کے عیسائیوں کے ذکر کو میں طوالت نہیں دینا چاہتا اس لئے کہ مجھے ان دونوں کے حالات سے بہت کم واقفیت ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی وسیع آبادی ہی انہیں عام توجہ کا مستحق ٹھہراتی ہے +

مگر میری خاص توجہ قدرتی طور پر مسلمانوں کی جانب مبذول رہی جیسا کہ سب کو معلوم ہے مسلمان دو مختلف راستوں سے اور دو مختلف حالات میں ہندوستان میں داخل ہوئے۔ پہلی مرتبہ وہ عرب تجار کی حیثیت سے اس کے مغربی ساحل پر نمودار ہوئے یہ لوگ اسلام پھیلانے اور روپیہ پیدا کرنے کی غرض سے آئے تھے یہ با امن مبلغین تھے جنھوں نے اپنی کامیابی کا دارومدار تلوار پر رکھنے کے بجائے ترغیب و تعلیم پر رکھا تھا اور اس طریقہ سے جو اسلام پھیلا اس کا وجود آج بھی مغربی ساحل پر بمبئی کے کونکنیوں مالا بار کے مپلاؤں اور سیلون کے موروں میں ملتا ہے۔ یہ سب لوگ خوشحال اور تجارت پیشہ ہیں اور تعمیرات کے کاموں میں بہت شہرت رکھتے ہیں +

کولمبو میں مجھے یہ دیکھکر بہت دلچسپی پیدا ہوئی کہ آٹھویں اور نویں صدیوں کے آباد ہونے والے عرب تجار کی اولاد عرب کی تجارتی روایات کو اب تک برقرار رکھے ہوئے ہے۔ تمام سیلون میں ان کی تعداد ۲½ لاکھ ہوگی اور وہ نہایت خوشحال ہیں۔ وہ بہت قدامت پسند ہیں اور دین کے بجائے اس دنیا کے کامون میں بہت انہماک رکھتے ہیں۔ جدید خیالات کا ان پر معمولی اثر پڑا ہے اور یہی عربی اور اُن کے جلاوطن ساتھیوں کا طفیل سمجھنا چاہیے جنھیں اسلامی دنیا کے وسیع حصہ کا تجربہ تھا اور جو مذہب کے لئے سینہ سپر ہو چکے تھے اُن کی آمد سے پیشتر جزیرہ کے مسلمان کبھی تبادلۂ خیالات کی غرض سے مجتمع نہیں ہوئے اور جب کم لوگ ایسے تھے جنکے بچے اسکول میں جاکر پڑھتے۔ مگر جلاوطنیوں کی تقلید کا آغاز جلد ہی ہوگیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ عربوں میں تعلیم کی خواہش پیدا ہوئی اور باقی مسلمانوں سے تعلقات رکھنے کا خیال آیا مصر کے مفتی کا یہ عجیب و غریب نتیجہ ہوگا۔ اگر اُس کے محب وطن سرداروں کی تکالیف جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں میں مذہبی آزادی کے خیالات پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔ لیکن یہی وہ بات ہے جو ظہور میں آرہی ہے کاش یہاں کے عرب دور دور پھیل جائیں کیونکہ ان کا تجارتی شوق اُن کی زندگی کا نہایت خوشگوار عنصر ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں میں اسی چیز کی بہت کمی ہے!

سیلون سے جب میں براعظم کی طرف گیا تو مجھے جو مسلمان ملے وہ شمالی حملہ آوروں کی اولاد سے تھے۔ یہ لوگ مذکورۂ بالا تجارت پیشہ مسلمانوں سے بالکل مختلف تھے اور نہ ویسے خوشحال دکھائی دیتے تھے۔ اور نہ ترقی کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ صوبہ مدراس کے مسلمان ہندوستان میں سب سے زیادہ غریب ہیں وہ مغلوں کے انتہائی عروج کے زمانہ میں یہاں آئے تھے۔ یہ مبلغین یا تو مسلموں کی اولاد نہیں ہیں بلکہ شمالی افواج کی اولاد ہیں اور چونکہ ان کی سرکاری ملازمت جاتی رہی ہے اس لئے وہ افلاس کے باعث بہت جلد صفحۂ ہستی سے ناپید ہو رہے ہیں۔ تانجور اور ترچناپلی جیسے شہروں کے مسلمانوں کی حالت نہایت ہی قابل رحم ہے۔ وہ ہندوؤں کی آبادی سے گھرے ہوئے ہیں، روایتی صنعتوں سے بالکل معرا ہیں، تجارتی شوق سے بالکل بے بہرہ ہیں اور تلوار کے ہنر کے سوائے بانی ہر ہنر سے ناواقف ہیں اور گونگوں کی طرح اپنی تباہی کے منتظر ہیں۔ اُن میں جو چند مالدار صاحب جائداد اشخاص دکھائی دیتے ہیں وہ دن بدن کم ہوتے جاتے ہیں اس لئے کہ محتاج اور غریب رشتہ داروں کی فوج ان پر گزر اوقات کرتی ہے۔ وہ ہندو مہاجنوں کے مقروض رہتے ہیں، سال بسال ان کے قرضہ جات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جو کچھ بچتا ہے اُسے عدالتیں ہڑپ کرجاتی ہیں۔ جو لوگ صاحب جائداد نہیں ہیں معمولی قسم کی محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ یہ نہایت سخت زندگی ہے مگر اس سے چھٹکارا کہاں ہوسکتا ہے۔؟ اُن کی قسمت کا دارومدار بظاہر اس قانون پر ہے کہ جو شخص روزی نہیں کما سکتا وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ جنوبی ہندوستان کے مسلمان اُن خرابیوں کے انتہائی نتائج پیش کرتے ہیں جو کم و بیش انکی تمام قوم میں پائی جاتی ہیں۔ جنوب میں اُن کی تعداد بہت کم ہے اور وہ اسقدر محتاج ہیں کہ اُن میں کشمکش حیات کی کوئی رمق نہیں پائی جاتی شمال میں انکی حالت کا خطرہ انھیں نئی جدوجہد کے لئے آمادہ کر رہا ہے۔

(باقی آئندہ)

ص، ا، ب، بی۔ اے

مثنوی "زہر عشق" کیونکر وجود میں آئی

ایک سے زائد مرتبہ مجھ سے سوال کیا گیا کہ میں "زہر عشق" کی شان نزول بتاؤں اور یہ اس لئے کہ حکیم نواب مرزا صاحب مصنف زہر عشق میرے نانا تھے۔

قبل اس کے کہ میں اس مثنوی کے سبب تصنیف پر روشنی ڈالوں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں حکیم صاحب اور ان کے خاندانی حالات مختصراً بیان کردوں۔ حکیم نواب مرزا صاحب کے چچا، حکیم الملک مرزا علی خاں، شاہان اودھ کے دربار میں بڑے مرتبہ پر فائز تھے اور طبابت میں ان کی حذاقت مسلم تھی۔ اُن کے صاحبزادے حکیم مسیح الدولہ بہادر علاوہ اور معزز عہدوں کے منصب سفارت پر بھی ممتاز رہے اور دربار میں مخصوص عزت رکھتے تھے۔

حکیم مسیح الدولہ بہادر، حکیم نواب مرزا صاحب سے عمر میں بڑے تھے اور اپنے چھوٹے بھائی (چچازاد) سے بہت محبت رکھتے تھے چونکہ حکیم نواب مرزا صاحب بہت خوش باش، عیش پسند اور رنگین مزاج تھے، اس لئے حکیم مسیح الدولہ بہادر نے اُنھیں دربار سے ہمیشہ علیحدہ رکھا اور محلات کا علاج اُن سے کبھی متعلق نہ کیا۔ لیکن جب اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کا زمانہ آیا تو نواب مرزا صاحب کی رسائی دربار میں پوری طور پر ہوگئی۔ نواب واجد علی شاہ، ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ۵۰۰ روپیہ ماہوار اُنکا مشاہرہ مقرر تھا اور انعام واکرام کی کوئی حد نہ تھی۔

حکیم نواب مرزا صاحب ایک ذی علم شخص تھے، طبیب حاذق تھے اور فنون مختلفہ میں انکا ذوق بہت اچھا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اپنے احباب میں جب کبھی شاعری کا ذکر کرتے تھے تو کھلے الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے تھے کہ مجھے فن شعر سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اور نہ وہ اس کے مدعی تھے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن بہت کم اور محض بغرض تفنن۔ انھوں نے رند کی غزل پر مصرعے بھی لگائے جو کلیات رند میں موجود ہیں۔ رند کی غزل یہ ہے:۔ جاتے ہیں وہ دریا کے کنارے کئی دن سے۔

ان مختصر حالات کے بعد اب میں زہر عشق کے سبب تصنیف کے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کرتا ہوں، چونکہ وہ واقعہ جس کی بنا پر یہ مثنوی لکھی گئی ہمارے ہی گھر کا تھا اور بچپنے میں، خود میں نے اپنی نانی سے اُس کو سنا تھا اس لئے غالباً میرے بیان سے زیادہ قابل وثوق بیان اس باب میں اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔

زمانۂ شاہی میں دستور تھا کہ لونڈیاں باندیاں خریدی جاتی تھیں اور اس بیع وشرا کے لئے قانون مانع نہ تھا۔ ہر شخص کو اختیار تھا

کہ وہ اپنی لڑکی یا بیوی کو فروخت یا رہن کر دے۔ چنانچہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ حکیم نواب مرزا صاحب کے پاس ایک شخص اپنی بیوی کو جس کا نام ستارہ تھا رہن رکھنے کے لئے لایا، معاملہ طے ہونے کے بعد ایک رقم اُس کو دی گئی اور وہ اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ شخص غالباً عراق جانے والا تھا۔ ستارہ جوان عمر کی خوش رو عورت تھی اور اسی کے ساتھ سلیقہ و تمیز بھی رکھتی تھی۔

حکیم صاحب کے ایک سالے مرزا عباس جن سے حکیم صاحب کو بہت الفت تھی اور جو حکیم صاحب کے ساتھ ہی رہتے تھے، عیاش طبع آدمی تھے۔ ان کی نظر التفات ستارہ پر پڑی۔ اُس وقت یہ دستور بھی تھا کہ ایسی زرخرید عورتوں کو ان کے مالک جائز یا ناجائز تعلق کے ساتھ اپنے تصرف میں لے آتے تھے، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ مرزا عباس سا رنگین مزاج شخص ستارہ ایسی خوش ادا اور جوان عورت کو ہر وقت گھر میں دیکھتا اور اس کا یہ التفات صرف التفات کی حد تک رہ جاتا، یہ تعلق بڑھا اور اس حد تک کہ حکیم نواب مرزا صاحب کو بھی معلوم ہو گیا۔

ایک زمانہ اسی طرح گزر گیا اور یہ دونوں بادہ کشان الفت اپنی جگہ یہی سمجھتے رہے کہ موجودہ کیفیت ایک لطف دوام ہے۔ لیکن ایک دن ناگہاں ستارہ کا شوہر آ ہی گیا اور اُس نے زر رہن واپس دیکر اپنی بیوی کا مطالبہ کیا۔ حکیم نواب مرزا صاحب نے اُس وقت اس کو یہ کہکر ٹالدیا کہ ستارہ محلات کے ساتھ کسی تقریب میں گئی ہے اس وقت موجود نہیں ہے اسی طرح ایک ہفتہ ٹل گیا، لیکن آخر کب تک، بہر حال وہ رات آئی جس کی صبح کو ستارہ کو رخصت کرنا تھا، اور یہی وہ تاریخی رات ہے جسمیں مثنوی زہرِ عشق کی بنیاد پڑی۔

حکیم نواب مرزا صاحب کی خوابگاہ خانہ باغ کے ایک بنگلہ میں تھی جو وسط چمن میں واقع تھا اور حکیم صاحب گرمی اور برسات کی فصل میں رات کو یہیں آرام کرتے تھے۔ اسی بنگلہ کے قریب ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں ان کے سالے مرزا عباس رہتے تھے۔ اس رات میں جسکی صبح کو ستارہ رخصت ہونے والی تھی، حکیم صاحب کی آنکھ کھلی اور وہ استنجا کی ضرورت سے باہر نکلے۔ جب مرزا عباس کے کمرہ کے قریب سے گزرے تو باتیں کرنے کی بھنک اُن کے کان میں پڑی۔ اُنھوں نے اور قریب جاکر دروازے سے کان لگائے تو معلوم ہوا کہ مرزا عباس اور ستارہ آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور اس قدر تاثر کے ساتھ کہ حکیم نواب مرزا صاحب بھی بہت متاثر ہوئے۔ ستارہ رو رو کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی اور مرزا عباس اُس کو تسکین دے رہے تھے۔ حکیم نواب مرزا صاحب پر اس واقعہ سے اتنا اثر پڑا کہ وہ اپنے اندر ایک خاص جذبۂ شعر گوئی محسوس کرنے لگے اور اسی جگہ جو تاثرات اُن کے اندر پیدا ہوئے اُن کو کوٹھیہ سے بنگلہ کی دیواروں پر لکھنا شروع کیا۔

رات کو حکیم نواب مرزا صاحب کے علم میں یہ بات نہ آئی تھی کہ مرزا عباس اور ستارہ کی یہ ملاقات ایک نہایت ہی خونیں صبح کے انتظار میں صرف ہو رہی تھی۔ جب صبح کے وقت یہ حقیقت واضح ہوئی کہ "زہر غم کر چکا ہے اپنا کام" اور ستارہ نزع کے عالم میں ہے تو سب کو سخت صدمہ ہوا اور آخر کار اس کے شوہر کو جو بنارس کا رہنے والا تھا مایوس جانا پڑا۔

نانی صاحبہ کہتی تھیں کہ جب میں صبح کو اٹھی اور حکیم صاحب کے بنگلہ کی دیواروں کو سیاہ پایا تو میں بچوں پر خفا ہونے لگی کہ تم لوگوں نے

دیوار کو خراب کیا ہے اور ایک عورت کو حکم دیا کہ کپڑا تر کر کے صاف کر دے لیکن جب حکیم صاحب کو خبر ملی تو وہ گھبرا کر باہر نکل آئے اور آواز دی کہ مٹانا نہیں۔ اسی وقت ان اشعار کی ایک نقل حکیم صاحب نے کرلی جو بڑھکر آج مثنوی زہرِ عشق کی صورت میں نظر آتی ہے۔

حال ہی میں مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی کا ایک مضمون حکیم نواب مرزا صاحب اور اُن کی مثنوی زہرِ عشق کے متعلق رسالہ سہیل میں شائع ہوا ہے مجھے اُن کی رائے سے کچھ اختلاف ہے۔

اسوقت چار مثنویاں لذتِ عشق، بہارِ عشق، فریبِ عشق، زہرِ عشق حکیم نواب مرزا صاحب سے منسوب کیجاتی ہیں۔ اُن میں سے لذتِ عشق کے متعلق عبدالماجد صاحب کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ وہ شوق کی زبان نہیں ہے (کیونکہ یہ آغا حسن نظم کی تصنیف ہے اور آخر میں اُن کا تخلص بھی موجود ہے) لیکن فریبِ عشق کے متعلق یہ کہنا کہ "وہ بمشکل اُن کی تسلیم کی جاسکتی ہے" درست نہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ بہارِ عشق، فریبِ عشق، اور زہرِ عشق یہ تینوں مثنویاں حکیم نواب مرزا صاحب کی ہیں جن میں پہلی مثنوی زہرِ عشق تھی اور ان کے جذباتِ صحیحہ کا نتیجہ تھی۔ اس کے بعد انھوں نے کئی مثنویاں اپنے احباب کے تقاضہ سے لکھیں اور اس لئے ممکن ہے کہ اُن میں وہ بات نہ پیدا ہوئی ہو اُن کے علاوہ ایک اور مثنوی انھوں نے قیصر باغ کی تعریف میں لکھی تھی جو طبع نہیں ہوئی۔

مولانا نے ان کی سیرت کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکیم صاحب موصوف کو صفیہ سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے، ۵۵ء کے لکھنؤ کو پیشِ نظر رکھکر اور اوس وقت کے اربابِ کمال و تہذیب کے دائرہ کا خیال کرکے مولانا قلم اٹھاتے تو ان کی ذات ان عیوب سے بھی پاک و صاف نظر آتی۔ اگر کچھ غلطی حکیم صاحب سے ہوئی ہے تو یہ کہ بجائے اصلی ہیرو کے اُنھوں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ یہ میں بآوازِ بلند کہنے کو تیار ہوں کہ متقدمین کی تعلیم میں ظرافت و زندہ دلی کا عنصر غالب ہوتا تھا، علی الخصوص وہ لوگ جو شاہانہ دربار کے رکنِ اعظم سمجھے جاتے تھے اس میں شک نہیں کہ مولانا نے عالمانہ تہذیب کے خیال سے بعض ——— جذباتِ محبت کو روحانیات سے متعلق کرکے کچھ تاویلیں کی ہیں لیکن اگر وہ اس زمانہ کے لوگوں کی صحیح زندگی کو پیشِ نظر رکھکر تنقید کی زحمت گوارا فرماتے تو اتنا شبہ بھی پیدا نہ ہوتا۔ علاوہ اس کے یوں بھی ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اگر وہ اس موضوع کو اختیار نہ کرتے جس کے لحاظ سے زبان اور محاورات کا استعمال ضروری تھا تو آج نصاب زبان کہاں سے دستیاب ہوتا۔ کیونکہ متقدمین کی کوئی مثنوی اس لحاظ سے زہرِ عشق کے برابر نہیں رکھی جاسکتی۔

حکیم صاحب کی بعض متفرق اشعار جو اس وقت مجھے یاد آ گئے درج ذیل ہیں۔

آپ کی گر نہربانی ہو چکی — تو ہماری زندگانی ہو چکی
بیٹھ کر اُٹھے نہ کوئے یار سے — انتہائے ناتوانی ہو چکی

.....

ہنس دئے رونے پہ وہ اے چشمِ تر — آبروئے اشکِ دل کی پانی ہو چکی

چمن میں شب کو گھرا ابر نو بہار رہا — حضور آپ کا کیا کیا نہ انتظار رہا

تصورِ مژہ اشکبار باقی ہے — برس کے کھل گیا بادل بہار باقی ہے

گئے جو عیش کے دن میں شباب کیا کرتا — لگا کے جان کو اپنے عذاب کیا کرتا
خیر سے موسمِ شباب کٹا — چلو اچھا ہوا عذاب کٹا

احسن لکھنوی

میری ڈائری کا ایک ورق

از ماہ تابہ ماہی ——

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

.....ء

آج صبح ہی سے ایک خاص قسم کی خستگی محسوس کر رہا ہوں، جسم کی نہیں روح کی۔ موسم کا تقاضا ہے کہ بسنت کی حسین دیوی کے شگفتہ قہقہوں کا لطف اٹھاؤں۔ اس کے زرد آنچل کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھ کر اس کا تعاقب کروں، اور گزر جانے والے موسم سرما کی تمام غیر شاعرانہ کیفیات کو محو کر کے پری بہار کی نزاکتوں اور رعنائیوں کی حضور میں تجدید محبت کروں اور اس سے بھی زیادہ وہ کروں جس کی ترغیب میں خیام کا یہ مصرع پیش کیا جاتا ہے :— "زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما" کیونکہ جب فضا رنگ و بو سے بھر جائے، ہوا جب چنگ رباب چھیڑنے لگے جسے صرف دل ہی سن سکتا ہے تو دنیا بھی عبیر و گلال ہی سے کھیلنا پسند کرتی ہے اس کا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ اپنے اندر اہتزاز رقص پیدا کرے، لیکن یہ بات نہ کہنے کی ہے نہ سننے کی کہ ایک حزین روح بھی نہایت نازک دیوی ہے، طبیعت کا ملال بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہے اور ٹوٹے ہوئے دل کی صدا بھی ایک مستقل نغمہ و سرود ہے۔

دنیا کی آبادی بہ لحاظ احساس دو قابل ذکر جماعتوں میں منقسم ہے۔ ایک طربیہ یا متفاول (Optimistic) جو فلسفۂ خیام کی مقلد ہے اور وعدۂ فردا پر لذت امروز کو قربان کرنا پسند نہیں کرتی۔ دوسری حزنیہ یا متشائم (Pessemistic) جو ہر بات کے ملول و حزین رُخ کو سامنے رکھ کر، نشاطِ حاضر کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے وہ پھول کو دیکھ کر قہقہہ و خندہ سے تعبیر کرتی ہے یہ اُسے صرف ایک زخم سمجھتی ہے، وہ نسیم کو زمزمۂ محبت خیال کرتی ہے اور یہ اس کو صرف آہ جانتی ہے۔ ایک ایرانی ادیب، عباس شاہ صفوی کے باغ کی تعریف کرتا ہوا صبح و شفق کی تعبیر ایک نہایت ہی لطیف مگر طربیہ استعارہ کی صورت میں اس طرح کرتا ہے کہ۔

صبح نسیمے ست از نسترن زارش گزشتہ، و شفق ہوائے ست از لالہ زارش برگشتہ

لیکن اسی منظر کے متعلق دوسری جماعت کے ادیب سے پوچھو تو وہ صبح کو "چہرۂ پریدہ رنگ" اور شفق کو "دامن خونیں زیر سنگ" کہہ دیگا عالم وجود یکسر مناظر و مرایا سے مرکب ہے اور یہ وہ نشانات باطلہ ہیں جن کی تعبیر ہر شخص اپنے ذہن و تصور کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ کر سکتا ہے

آگ روشن ہوکر چاروں طرف کی فضا کو منور کردیتی ہے، ابتھر وہی ہے لیکن شعلہ کا انعکاس اسے رنگین بنائے ہوئے ہے۔ سطحی نگاہ سے دیکھنے والے کہہ سکتے ہیں کہ ہوا رنگین ہے حالانکہ رنگ ہوا میں کہاں، شفق، چہرۂ آفتاب کا صرف آئینہ ہے، لیکن دنیا نے اس کا ایک علیحدہ نام رکھدیا ۔۔ یہی وہ تاثرات تھے جن کی بنا پر بیدل یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔

بیدل آن گوہر نایاب سُراغ — بہ محیطے ست کہ پرسیدن نیست
عکس افتادہ در آئینۂ ہوش — گُل توان گفت نۓ چیدن نیست

میں انھیں خیالات میں محو تھا کہ میرے ایک گم گشتہ دوست کی تحریر دوپہر کی ڈاک سے موصول ہوئی، لکھا تھا:۔

بمبئی آئے، اور اس چیز کو جسے آپ نے فتحپور کی ویرانیوں میں گم کیا تھا، ساحل قلابہ پر ڈھونڈھ لیجئے جسوقت آخری بار میں آپ سے ملا تھا اس کے بعد سے دنیا کے ساتھ میں بھی ایسا بقدر دس سال ضعیف ہوگیا ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ شباب میرا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہیں ۔۔۔ اگر حسن کی پیدائش جاری ہے تو سمجھ لیجئے کہ میری بت سازگی بھی ایک مستقل بالذات جوہر غیر فانی ہوکر رہگئی ہے۔ آپ کو یقین نہ آئے گا، لیکن میرا تجربہ ہے کہ جس چیز کی زکوٰۃ ادا کرتے رہئے اس میں ترقی ہوتی رہیگی۔ زکوٰۃ حسن سے افزونیِ جمال کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن شباب کے باب میں اس مسئلہ کی صداقت پر مجھے کامل اعتقاد ہے ۔ آپ کہیں گے کہ ایک جُگ کے بعد میں نے آپ پر اثباتِ وجود بھی کیا تو اس انداز سے۔ لیکن کیا کروں۔ آپ کو یاد کرنے کی فرصت مل گئی ہے تو جی نہیں چاہتا کہ آپ کو اس نشہ سے بیگانہ رکھوں جو مجھ پر ایک مرض کی طرح طاری ہے۔ غالب کی اس حسرت کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ:۔

"کجا زہرۂ صبح و جام بلور"

اور یقیناً یہ اجتماع بڑی "خدا ساز" بات سمجھی جاتی ہے، یعنی مذہب اس زندگی میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ اس کی شکایت بھی کیجاتی ہے، حالانکہ جو چیز ترک اسلام کے بعد حاصل ہوسکتی ہے وہ ترک اسلام ہی کے بعد ملے گی۔ یہاں نہ کوئی دعا تھی نہ اس کے ردوقبول کا جھگڑا، فکر فضول، تھی اور حیرات رندانہ! پھر کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا "کہ" زہرۂ صبح بھی ہے اور جام بلور بھی" "ماہ چہاردہم بھی ہے اور بادۂ انگور بھی" آپ کو یاد ہوگا جب میں ساری دنیا کا غم دل میں لئے ہوئے تڑپتا تھا، اب کائنات کو فراموش کرنیکے بعد معلوم ہوا کہ دنیا نام ہے صرف اپنا اور اُن کا ——— ہمیں جائے من وجائے تو باشد! کیا آپ کبھی میرا یہ احسان فراموش کرسکتے ہیں کہ میں نے اس عالم میں بھی آپ کو یاد کیا!

اس دس سال کے زمانہ میں مجھ پر کیا گزر گئی، آسمان کا ایک ایک ستارہ اس سے واقف ہے، فضا بسیط اس داستان درد سے شاید اب بھی لبریز ہوگی، اگر آپ اس نوائے راز کی محرم ہوں تو سُن لیجئے، سمجھ لیجئے مجھے اس کے اعادہ و تکرار پر مجبور نہ کیجئے، مجھ سے تو اب صرف یہ پوچھئے کہ "جب ساری دنیا سوتی ہوتی ہے تو تم کیا کرتے ہو"۔ میر کی طرح میں آہ نہیں کرتا، کروٹیں نہیں بدلتا، آنسو نہیں بھاتا ——— میں جاگتا رہتا ہوں، میرا طالع جاگتا رہتا ہے، نہ سوتا ہوں، نہ سونے دیتا ہوں، ہنستا ہوں، ہنساتا ہوں، مجروح ہوتا ہوں، مجروح کرتا ہوں، یہاں تک کہ جب میری دنیا میں صبح کا آفتاب دن کو بارہ بجے طلوع ہوتا ہے تو اس وقت بھی کوئی یہ کہکر ایک ریشمی معطر چادر میرے سر پر کھینچ کر ڈال دیتا ہے کہ "ہوگا بھی" اور میں پھر غافل ہو جاتا ہوں ——— "دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم"

ذرا صبر کیجئے۔ میں آپ کو ابھی اور جلانا چاہتا ہوں ——— آپ کو یاد ہوگا جب ہم آپ کسی وقت ایک "رند شاہد باز" کی فرضی تصویر کھینچکر گھنٹوں خیالی لطف حاصل کیا کرتے تھے۔ مجھے خبر نہیں آپ کس عالم ہیں، لیکن یاد کیجئے کہ عملی دنیا میں آنے کے ہی بعد یہ حقیقت روشن ہو سکتی ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کا خیال بھی اُس ایک دل کی حقیقت تک نہیں پہونچ سکتا جو بے اختیارانہ طور پر بیک وقت تمام وہ قیامتیں جو ابھی تک ابد میں پوشیدہ ہیں کسی کے لب یا جنبش چشم و ابرو سے نکل کر دل کو مسحور کر لیتی ہیں ——— خدا کی قسم رند ہونا بھی کتنی بڑی نعمت ہے ——— لوگ اپنی تباہیوں پر مذہبی تسکین کی جستجو کرتے ہیں جہاں سے دیکھئے بڑی کائنات "دعا ہے" "یا تقدیر" ——— ذرا ان دونوں کی بے نمکی کو ملاحظہ کیجئے۔ معاذاللہ ——— اور پھر اس کے بعد بھی سکون معلوم ——— برخلاف اس کے، میری دنیا کے مراتب و مدارج کو ملاحظہ کیجئے کہ یہاں ہر بربادی ایک ایثار ہے اور ہر ناکامی اعترافِ لطف ——— آپ ہی انصاف کیجئے کہ شکایت و شکر میں کتنا تفاوت ہے۔ ایک وہ ہیں جو ظلم سے ڈرتے ہیں اور ایک وہ جو ستم کو دعوت دیتے ہیں، اور ستم بھی شدید ترین ——— آپ جانتے ہیں وہ شدید ترین ظلم کیا ہے؟ التفات فراواں ——— لطف بسیار ——— اچھا اندازہ کیجئے ——— "وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے" اگر صرف اپنی آغوش کے لئے وقف ہو، تو کیا ہو؟ ——— غالب کے فلسفہ کے لحاظ سے یہ ہو کہ خدا بھی رشک کرے دنیا کا کیا ذکر ہے، اور میں ——— اب یہ نہ پوچھئے، کیونکہ اس بربادی کا افسانہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، سننے کی چیز نہیں ———

اب میں ختم کرتا ہوں، لیکن ایک بات اور سُن لیجئے ——— نگاہ اولین کا افسانہ ہے اس کی لذت

کو میں اب تک چھپائے ہوئے تھا۔ خیر تفصیل کا موقع نہیں اور نہ جرأت، مختصر کہنے میں خدا جانے آپ سمجھ سکیں یا نہیں۔ خیر، یوں سمجھئے کہ ——— ، پیام روح تھا، نوید فردوس تھا، اور زیادہ غیر دلچسپ مذہبی زبان میں اشارۂ غیبی تھا، الہام فطرت تھا —— ہاں لبوں سے زیادہ پُر لطف وہ بوسہ ہے جو ایک نگاہ جھک کر دوسری نگاہ کو دیتی ہے —— اسی کے یہ مختلف نام ہیں —— آپ کو جو پسند ہو انتخاب کر لیجئے، میں اُسے صرف "خدا کو بھلا دینا" کہتا ہوں۔ کیونکہ انتہائی لذت وہی ہے جس کی ابتدا اس کیفیت سے ہو۔ شام کا وقت تھا لیکن شفق سے شرابور، اُدھر سورج ڈوب رہا تھا اور ادھر ایک بدر کامل طلوع کر رہا تھا، اُسکی چاندنی سمٹ کر ایک نقطہ میں تبدیل ہوئی اور پھر بڑھکر تار نظر میں آپ کو شاید نہ معلوم ہوگا کہ اس ترکیب سے جو پیکاں تیار ہوتا ہے وہ الٹ کر صاحب ترکش کو بھی مجروح کر دیتا ہے۔ یہ جراحت نام ہے اس تبسم کا جو ہونٹوں پر نہیں بلکہ چتونوں پر نمایاں ہوتا ہے —— مجھے اس کا ہوش اُس وقت ہوا جب ساحل قلابہ کی تاریکی میں صرف ایک ہی روشنی جگمگا رہی تھی۔ کہاں؟ میرے پہلو میں، میری آغوش میں، میری نگاہ کے سامنے میرے لبوں سے نزدیک اور میری روح کے اندر —— طلوع و غروب کا مفہوم بدلکر اب صرف یہ رہگیا ہے کہ وہ "ہیں" اور "نہیں" ہیں، لذت و الم کے حقیقی فلسفہ کا راز منکشف ہوگیا اور اس طرح کہ میں اُن سے دور ہوں، یا نزدیک —— ہائے وہ رات جس کی صبح کا مفہوم میرے لئے سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ "بوئے یاسمن باقی ست" —— میرے لئے قائم ہو کر رہگئی ہے، میں نے یا کسی اور نے زمین سے اس کی گردش سلب کر لی ہے ہیئت کے نظام کو بدل دیا ہے اور گرمی کی دوپہر کا آفتاب بھی مجھ پر چاند کی خنک شعاعیں ڈالتا ہوا نظر آتا ہے ——

حکم بر ستارہ کنم" تو نہایت ضعیف سی بات ہے، یہاں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میری محکوم ہے اور اگر میں برہم ہو جاؤں تو شاید خدا ساری دنیا سے بیزار ہو کر منہ موڑ لے ——— فرصت ہو تو آئیے اور دیکھ لیجئے کہ خلیفۃ اللہ فی الارض، زمین پر کیا آفتیں ڈھا رہا ہے۔ .....

.....

.....

.....

یہ وقفہ آپ سمجھے کیا تھا —— میں وہاں تک لکھ چکا تھا کہ چپکے چپکے پشت کی طرف سے ایک ہاتھ سے آنکھیں بند کر لی گئیں اور دوسرے ہاتھ سے خط چھین لیا گیا ——— میری آنکھیں نازک حنائی انگلیوں کو چوم رہی تھیں

اور ان کی نگاہیں تحریر کے ایک ایک حرف کو ـــــ آنکھ سے ہاتھ ہٹا مگر ہونٹوں کو مسلتا ہوا، خط ہات سے چھینک دیا گیا لیکن مجھے "شریر" بناتا ہوا ـــــ اب آپ سے بھی باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اجازت دیجئے تاکہ اس فضا معطر میں آنکھیں بند کرکے بیہوش ہو جاؤں ـــــ

آپکا

آپ سے باہر

.....

پورے دس سال کے بعد ..... کی یہ تحریر مجھے ملی۔ اس زمانہ میں مجھے اور اس کے تمام احباب کو یقین ہو گیا تھا کہ یا تو وہ مر گیا ہے یا ہندوستان سے باہر کسی دور دراز مقام کو چلا گیا ہے ـ اس لئے مجھے اس کا خط دیکھ کر بہت مسرت ہوئی اور تھوڑی دیر کے لئے میرا حزن وملال دور ہو گیا ـــــ اس وقت اُس کی تمام باتیں ایک ایک کرکے مجھے یاد آ رہی تھیں اور اس کی تمام وہ رعنائیاں اور خوش ادائیاں جنکو دیکھ کر میں "جوانمرگی" کی پیشین گوئی عرصہ ہوا کر چکا تھا۔ نگاہوں کے سامنے تھیں ـــــ آخرکار وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا ـ اس سے زیادہ "جوانمرگی" اور کیا ہو سکتی ہے ـ میں سمجھتا تھا کہ اس کے لئے صرف ایک نگاہ ادا شناس کی ضرورت ہے۔ اور اگر کبھی مل گئی تو پھر نہ اسے زندہ چھوڑ سکتی ہے، نہ خود عرصہ تک زندہ رہ سکتی ہے۔

اس وقت میں بیقرار تھا کہ کسی طرح اُس کی گزشتہ زندگی کی ساری داستان سُن سکتا۔ گھڑی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ابھی اسپیرس کے روانہ ہونے میں ایک گھنٹہ کی دیر ہے ـ فوراً ایک ضروری تار لکھا کہ ـ "صبح کو بمبئی پہونچونگا" اور سامان سفر کی طیاری میں مصروف ہو گیا

نیاز

نوٹ :ـ بمبئی پہونچنے کے بعد کے واقعات ڈائری کے دوسرے صفحہ میں ملاحظہ فرمائیے جو آئندہ ماہ میں شایع ہوگا۔

دواؤں کا حیرت انگیز عمل

اگر کوئی شخص کہے کہ صرف دوا آگ پر رکھنے سے جس کو چاہیں آپ مسخر کر سکتے ہیں تو آپ کو یقین نہ آئے گا، اور اگر ہم یہ کہیں کہ اس دوا کو ہمنے متعدد بار آزما کر بالکل صحیح پایا تو آپ کو اور زیادہ حیرت ہوگی اچھا تو ایک بار صرف آزمائش ہی کے طور پر آپ اُس شخص کا نام لکھ کر بھیجدیں جسکو آپ مسخر کرنا چاہتے ہیں ہم آپ کو ایک سفوف بھیجدیں گے آپ اس کو جلا کر دوا کا معجزہ ملاحظہ کیجئے اس سفوف کی قیمت صرف ہے لیکن آزمائش کے طور پر پہلی مرتبہ ہم آپ کو تین روپیہ میں دیں گے اُس کے بعد اصلی قیمت لیجائیگی۔

منیجر دواخانہ شفائی نظیر آباد لکھنؤ

لکھنؤ کی صحیح رنگ کی شاعری

اور

جاوید مرحوم

عنوان بالا کا اقتضا یہ تھا کہ پہلے لکھنؤ کی صحیح رنگ کی شاعری کو واضح کیا جاتا اور پھر یہ بتایا جاتا کہ جاوید مرحوم کو اس سے کیا تعلق تھا، لیکن میں اس بحث میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا، کیونکہ اب یہ مسئلہ کوئی راز مخفل نہیں رہا اور یوں بھی اس سے قبل خیابان یا اہل خیرآبادی کے متعلق ایک مضمون کے دوران میں اصولی گفتگو اسپر کر چکا ہوں، بہرحال بغیر اس بحث کو چھیڑے ہوئے آج کی صحبت میں لکھنؤ کے ایک ایسے شاعر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جو اب سے صرف چھ سال قبل یہاں کی فضا میں سانس لے رہا تھا اور جس کی شاعری حقیقت یہ ہے کہ لکھنوی شاعری کا نہایت دلکش نمونہ تھی۔

عام طور پر دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں وجہ امتیاز یہ بتائی جاتی ہے کہ وہاں جذبات و کیفیات سے بحث کی جاتی ہے اور یہاں صنعت زبان اور محاورات سے، لیکن میرے نزدیک یہ درست نہیں، کیونکہ جذبات و کیفیات سے خالی تو کوئی شعر ہو ہی نہیں سکتا خواہ میر کا ہو یا امیر کا، البتہ جذبات و کیفیات کی نوعیت اور اُن کے اظہار میں ضرور فرق ہوتا ہے اور یہیں سے دہلی اور لکھنؤ کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں شاعری الفت و محبت کی زبان ہے اور اس کے ماتحت جو جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں اُن کے لئے دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کی گلیاں یکساں حکم رکھتی ہیں، لیکن شاید یہ سرزمین یا اختلاف آب و ہوا کا اثر ہے کہ دہلی کا شاعر خراب الفت ہونے کے بعد ایک دنیا اپنی علیحدہ قائم کر لیتا ہے جہاں وہ کائنات سے بے نیاز ہو کر شعر نہیں کہتا بلکہ اپنے جذبات ایک حزین راگنی میں گنگنایا کرتا ہے اور لکھنؤ کا شاعر طالع ناساز کی تمام یاس آفرینیاں دیکھنے کے بعد بھی کوچۂ محبوب کو نہیں چھوڑتا۔

محفل یار میں غیروں سے "اُن" کا التفات دیکھ دیکھ کر جل رہا ہے، مر رہا ہے، لیکن ایک سرکش گدا کی طرح وہاں سے ٹلتا نہیں، یہاں تک کہ وہیں دم دیتا ہے، ذبح ہو جاتا ہے اور اُس کی زندگی نہیں بلکہ موت کا بڑا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کا محبوب بھی بازلف پریشاں اس کے جنازہ کے ساتھ ساتھ ہے۔ لکھنؤ میں تاثرات محبت کی یہ فضا پیدا ہو جانا جس میں دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے نزع، جانکنی، ماتم، واویلا، بین، شیون، جنازہ کے مناظر سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ ایک حد تک ضروری تھا کیونکہ یہاں کے اکثر شعراء ایسے مسلک کے پابند ہیں جس کی رو سے اُنھیں سال کے بارہ مہینوں میں تقریباً ہر مہینے کسی نہ کسی طرح اس نوع کے جذبات کو زندہ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ پھر انسان کے جذبات پر ماحول ہی کا اثر نہایت قوی ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ خود ذاتی معاشرت اور مذہبی معتقدات کہ

اس کے اثرات سے بچنا کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ اسی لئے لکھنوی شاعری کا یہ دردمند پہلو جس میں مرثیہ کا رنگ زیادہ جھلکتا ہے۔ دردناک تو ہے۔ لیکن خودداری اور وقار کی بلندی نہیں رکھتا۔

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا رخ وہ ہے جس کا تعلق صرف "محفل طرازیوں" سے ہے اور جہاں عامتہ الورود جذبات الفت سے بحث کی جاتی ہے۔ اس رنگ میں لکھنؤ کا شاعر ہر پسند "اہل نظر" کی حیثیت سے اپنے آپکو پیش نہیں کر سکتا لیکن ایک بدذوق کی حسن پرستیاں بھی ہمیشہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہوتیں میرے ایک دوست نے مرزا تعشق مرحوم کا یہ مصرع "نام سے تعویذ کے باندھے گئے بازوئے دوست" نہایت کراہت کے ساتھ پڑھا اور فرمایا کہ یہ بھی کوئی شاعری ہے۔ میں خاموش ہو گیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اُن غریب کو کبھی کسی کے گورے گورے بازو دیکھنے ہی نصیب نہیں ہوئے، چہ جائیکہ وہ وقت آرائش اُن پر رنگین ریشمی فیتوں کے تعویذ بندھتے دیکھتے۔ دوسرے دن اتفاق سے شاہ مینا صاحب کی نوچندی میں میرا ان کا ساتھ ہو گیا ایک مغنیہ اور کانی حسین ـــ گا رہی تھی اور وہی مایہ انتزاع تعویذ اس کے بازو پر بندھا ہوا تھا جیسا اس وقت تو وہ صرف مسکرا کر رہ گئے لیکن سنا ہے کہ اس کے بعد کسی اور جلسے میں جب مرزا تعشق کی شاعری کا ذکر آیا تو انھوں نے اس مصرع کی بھی تعریف کی کہ "نام سے تعویذ کے باندھے گئے بازوئے دوست"

الغرض لکھنوی شاعری کا یہ رُخ ضرور قابل لحاظ ہے اور ایک "رند شاہد باز" کی زندگی کے بہت سے نکتے اس میں تلاش سے مل جاتے ہیں حیات انسانی کے واقعات میں یہ جستجو کرنا کہ فلاں امر موزوں ہے اور فلاں ناموزوں، لغو سی بات ہے۔ حقیقت کے لحاظ سے دیکھئے تو میر و درد بھی ویسے ہی ناکارہ نظر آتے ہیں جیسے جان صاحب، کیونکہ انقلاب عالم اُن میں سے کوئی نہیں پیدا کر سکا، پھر جب سوال صرف وقت ضایع کرنے کا ہے، تو اس میں یہ جستجو کرنی کہ کس نے اچھی طرح وقت ضایع کیا اور کس نے بُری طرح، لایعنی سی بات ہے۔ مولویانہ انداز میں زیادہ سے زیادہ فرق اگر کوئی ظاہر کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ بلند جذبات سے ہمارا خیال معصیت سے ہٹتا ہے اور پست کیفیات کا شعر اس طرف مائل کرتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک مولوی کو اس بحث میں پگڑی اچھالنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ گناہ کی لذتوں سے واقف ہوئے بغیر، خواہ مخواہ گناہ کو گناہ کہدینا کہاں کا انصاف ہے ـــ علی الخصوص اس وقت جبکہ موت کی نگاہ میں ایک زاہد شب زندہ دار اور ایک رند بادہ خوار دونوں ایک درجہ رکھتے ہیں موت کے بعد کا سوال نہ اٹھائیے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے اور سب سے بڑا شاعر وہی ہے جو سب سے زیادہ مذہب سے علیحدہ ہو۔ بہرحال، مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ لکھنؤ کی شاعری بھی اپنی جگہ خاص چیز ہے۔ اگر کوئی اسی کو تکمیل کے ساتھ ادا کر سکے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ دنوں سے شعرائے لکھنؤ میں دہلی کی تقلید کا خیال قوی ہوتا جا رہا ہے اور حقیقتاً مجھے افسوس ہوتا ہے جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ دہلی کی آب و ہوا یہاں آ نہیں سکتی اور لکھنؤ کی وہ مخصوص فضا بھی اس کوشش میں برباد ہو رہی ہے اور بیان کی روانی، زبان کی پاکیزگی، الفاظ کی شائستگی، محاورات کی شگفتگی جو اہل لکھنؤ کا حصہ تھی مفقود ہوتی جاتی ہے۔

ایک دن میں اپنے عزیز دوست مولوی عبدالباری صاحب آسی سے اس بحث پر گفتگو کر رہا تھا کہ انھوں نے مجھے جاوید مرحوم کے

دو چار شعر سنائے۔ چونکہ ایک زمانہ کے بعد میں نے لکھنؤ کے صحیح رنگ کے یہ شعر سنے اس لئے مجھے بہت لطف آیا اور میں نے خواہش کی کہ انکا کلام فراہم کیا جائے۔ لیکن جستجو کی گئی تو مایوسی ہوئی کیونکہ سوائے چند اشعار کے ان کا سارا کلام ضائع ہو چکا ہے اور اب کوئی امید اس کے ہاتھ آنے کی نہیں ہے۔ چونکہ جناب جاوید مرحوم کو حضرت آسی سے خصوصیت خاصہ حاصل تھی اور وہ اپنی ہر غزل آسی صاحب کو سنا دیا کرتے تھے اس لئے کچھ شعر ان سے ملے اور کچھ جناب جاوید کے بھائی سید مجاور حسین تمنا سے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان کے کلام پر کیا تنقید ہو سکتی ہے لیکن یہ خیال ہے کہ ممکن ہے چند دن بعد یہ اشعار بھی گم ہو جائیں میں انھیں نگار میں درج کئے دیتا ہوں۔

مختصر حالات

آپ کا نام سید محمد کاظم تھا اور بعض لوگ آپ کو حضرت بندہ کاظم کے نام سے یاد کرتے تھے، تخلص جاوید تھا اور ۱۲۹۰ھ میں یا اس سے کچھ قبل یا بعد آپ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مولوی سید محمد جعفر اللہ اور دادا کا مولوی سید باقر تھا۔ زمانۂ شاہی میں آپ کے دادا انجی کی خدمت پر مامور تھے۔ آپ کے نانا مولوی سید علی حسین بھی نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیمی حالت کے متعلق مفصل حالات معلوم نہیں ہو سکے لیکن یہ یقینی ہے کہ آپ بے علم شخص نہ تھے۔ انتقال کے وقت آپ کی سکونت محلہ پاٹا نالہ میں تھی لیکن اپنے والد کے زمانہ میں سرائے غلی خاں میں رہتے تھے جہاں آپ کے دادا کے کئی ذاتی مکان موجود تھے۔

شاعری کا شوق آپ کو نہایت صغیر سنی سے تھا، چنانچہ سب سے پہلے آپ نے اپنے والد جناب اُمید ہی کو اپنا کلام دکھایا، اُن کے بعد سید اصطفا صاحب عرف لڈن صاحب خورشید لکھنوی سے اصلاح لی۔ سنا جاتا ہے کہ آپ بہت زود گو تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ ۴ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو دو روز تک سانجر میں مبتلا رہنے کے بعد ۵۰ سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی اور جناب غفران مآب کے امام باڑے میں دفن کئے گئے۔ ان کا مجموعۂ کلام دو جلدوں پر مشتمل تھا جن میں علاوہ غزلوں اور رباعیوں کے تقریباً ۱۰ مرثیے بھی تھے۔ لیکن یہ مجموعہ ایک صاحب جو اُن کے دور کے عزیز تھے اُٹھا لے گئے اور پھر اس کا پتہ نہ چلا۔

آپ نہایت وسیع الاخلاق، منکسر مزاج اور ہر دل عزیز انسان تھے اور محرم کے زمانہ میں دور دور مقامات سے حدیث خوانی کیلئے طلب کئے جاتے تھے۔

کلام

ان کے جو اشعار دستیاب ہوئے ہیں ان کی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جاوید صحیح معنی میں لکھنوی شاعر تھے اور جتنی باتیں اس رنگ کی شاعری میں ہونی چاہئیں وہ سب آپ کے ہاں پائی جاتی تھیں ممکن ہے کہ آپ نے کبھی اس رنگ سے ہٹ کر بھی کچھ کہا ہو لیکن اس کا ثبوت دشوار ہے۔ ان کے ہاں یقیناً تخیل بلند نہیں ہے اور جذبات بھی عمیق نہیں ہیں، لیکن معاملات حسن و عشق کے بیان کے جتنے اسلوب ہو سکتے ہیں وہ سب ان کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اُن کا جوش معمولی سطح سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔

مثلاً آپ کا ایک شعر ہے:-

یہ اپنے چاہنے والوں سے آپکا برتاؤ ۔۔۔ یہاں تک آتی ہے آداب ترانی کی

لن ترانی کا مضمون نہایت پامال چیز ہے، لیکن جاوید صاحب نے جس جوش اور اسلوب کے ساتھ اُس کو ظاہر کیا ہے اس نے ایک ایسی خاص کیفیت پیدا کر دی ہے جس سے مضمون میں تازگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اسی زمین میں ایک شعر اور جوانی کے قافیہ کا ہے:۔

جو بچنا ہے تو میری طرف سے پھیر لو منہ
یہ کوئی کھیل نہیں موت ہے جوانی کی

جناب جاوید نے جو امر گی کا منظر دکھانے کے لئے الفاظ سے جو فضا پیدا کی ہے وہ یقیناً ایک ایسی مصوری ہے جو باوجود عامیانہ تخاطب کے بھی سننے والے کے دماغ کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی قافیہ میں ایک شعر اور ہے لیکن دوسرے عالم کا کہتے ہیں۔

ہماری عمر سے کچھ روز گھٹتے جاتے ہیں
قسم حضور نہ کھایا کریں جوانی کی

کسی کے جوانی کی قسم کھانے پر شاعر کے خیال کا اس طرف منتقل ہونا کہ ہر قسم کے ساتھ اس کے عمر کے دن گھٹتے جاتے ہیں۔ ایسا شدید جذبۂ شوق ہے کہ مشکل سے اسمیں کوئی اضافہ ہو سکتا ہے۔ ہر چند جوانی کی قسم کھانا کوئی شائستہ و مہذب بات نہیں ہے لیکن اگر کوئی ایسا کرے تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ اس طرح ذکر شباب کیا جائے اور سننے والا ٹھنڈے دل سے اسے سُن لے۔ جاوید صاحب نے اپنے تاثر کو پہلے مصرع میں جس خوبی سے ظاہر کیا ہے وہ یقیناً معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔

لطف زبان، سلاست ادا کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

اب اک بوسہ پہ اتنی بحث زیبا ہے نہ شایاں ہے
نگاہیں نیچی کر لو، خیر، اچھا لے لیا ہوگا

ابتدا محبت کی کیفیات پر غور کر کے مستقبل کی طرف سے جو اندیشہ چاہنے والے کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ بہت عام بات ہے لیکن اس جذبہ کو ایسے اسلوب سے بیان کر دینا کہ دل کی صحیح کیفیات ظاہر ہو جائیں۔ بہت دشوار ہے۔ جاوید صاحب اس میں جسقدر کامیاب ہوئے ہیں ذیل کے شعر سے معلوم ہو سکتا ہے:۔

ابھی تو آگ سی دل میں کہیں کم ہے کہیں زاید
اگر مل جائیں گے آپس میں سب چھالے تو کیا ہوگا

مسرت و نشاط یا حزن و ملال نام ہے صرف اپنے احساس کا دنیا میں کوئی شے اِن کیفیات کی حامل نہیں ہے، اگر اپنا جی خوش ہے تو ہر منظر اچھا معلوم ہوتا ہے: ورنہ دنیا کی نشاط انگیزیاں بھی ماتم سے کم نہیں۔ اس فلسفہ کو جاوید اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کفن پہنے ہوئے خود چاندنی آئی مرے گھر میں — خدا عالم نہ دکھلائے شبِ مہتاب ہجراں کا

ان کے بعض شعر یہ ہیں :-

اداسی چارہ گر کے منہ پر جب آتی ہوئی دیکھی
میں سمجھا یہ کہ ٹوٹا زخم کا میرے کوئی ٹانکا

مہ شباب میں جو دل بجھا وہ پیری میں
چراغ صبح تھا جب شب کا اعتبار نہ تھا
ہزار بار رکھا ہاتھ اُس نے سینہ پر
کہ میرے دم کے نکلنے کا اعتبار نہ تھا

حدسے افزوں ہے یہ کہکر میں بھی اک مشکل میں تھا
سب سہی پر درد اتنا تھا کہ میرے دل میں تھا
حال دنیا پوچھتے ہیں اہل محشر دیکھنا
مرنے جینے کا مزہ سب کو جدا کل ہی ہوا تھا

اٹھائیں دست نازک سے وہ خنجر ذبح ہوتا ہوں
میں کروں مشکل آساں انکا وہ کریں مشکل میرا

نہ جانے وصل میں کیا تھا ہوا ہی ہجر میں کیا
جو پھول کل تھے وہ کانٹے ہیں آج بستر پہ

مرنے کی اک اُمید پہ جی جائیں بے نصیب
تم بھی کسی کے غم میں اگر سوگوار ہو

کہتے ہیں دیکھ کر مری صورت یہ اُن سے غیر
اب اس کے رنج کی نہ کوئی بات کیجئے
کیا آشنائے لذت دیدار اُس طرف نہیں
محفل میں منہ کو پھیر کے کیوں بات کیجئے

ہم جس کو عمر سمجھے مدت ہی اُس کی کیا تھی
اتنا نہ کہنے پائے کس فتنہ گر نے مارا

اب کہاں تھا میں جو دیتا اس محبت کا جواب
جس کی تربیت دیکھ لی مجھکو صدا دینے لگے

ارے یہ حشر ہے میں سیکڑوں ترے مشتاق
یہاں پہ ہم بھی ہیں راضی نقاب ڈال کے چل
کہیں یہ تفرقہ انداز چرخ دیکھ نہ لے
نہ اس طریق سے باہیں گلے میں ڈال کے چل

کل بھی گر پوچھا نہ تو مان لوں دیکھ لی ہے آج صورت آپ نے

اک جماہی سی سے محفل میں آکر رہ گئی میں یہ سمجھا اک کلی بھی مسکرا کر رہ گئی
اب نہیں معلوم زخمی کون محفل میں ہوا تیر کی آواز کچھ کانوں میں آکر رہ گئی

شب تاریک ہجر آتی ہے جاوید سویرے سے چراغوں کو جلا لو

رات کو دریا میں موجیں کس طرح اچھلیں نہیں اک کنارہ جا رہا ہے اور اک کنارہ آ رہا ہے

تم آنکھوں میں ہیں اتنے کہ کھٹک ہوتی ہے کچھ تو نسو مری آنکھوں سے نکل جانے دو

نیاز فتحپوری

بہرام کی آزادی	ص ۲۱۶		
تاثر صاحب کی اولاد	ص ۱۲۸		
دنیا دار دامن	ص ۱۰۰		
شکوۂ محبت	ص ۱۰۲		
زیر بست	ص ۱۱۲		
بلاسے بد	ص ۵۳		
نصیب وطن	ص ۹۲		
خونی ساحر	ص ۱۲۳		
حسین قزاق	ص ۹۲		
بنجی کا راز	ص ۱۱۲		
شہر بند	ص ۱۸۰		
گم گشتہ	ص ۴۹		
دیبا جمیلہ	ص ۴۲		
تیکرس خانہ دنیا	ص ۸۸		
خانگی خدا نداں	ص ۹۲		
حرکت	ص ۱۰۰		
حسن	ص ۲		

استفسارات

حُسن یوسفی

(جناب معزالدین صاحب ۔ کمال گنج)

مشہور شعر ہے :۔ حسن یوسف اوم عیسیٰ ید بیضا داری
بچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری

شاعر نے موسیٰ کے ید بیضا اور عیسیٰ کی مسیحا نفسی کے سلسلہ میں حُسن یوسفی کو بھی ایک معجزہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ حسن یوسفی اگر معجزہ تھا تو کس طرح اور کس فائدہ کی غرض سے۔

(نگار) الغرض کبھی نہ کبھی آپ حضرات مجھے ایسے مسائل پر لکھنے کے لئے مجبور کر ہی دیتے ہیں، کوئی نہ پوچھے تو مجھے خیال بھی نہیں ہوتا۔ لیکن استفسار کے بعد خاموشی یا خلاف ضمیر گفتگو میرے کیش کے خلاف ہے۔ آپ تو شاید نہیں، لیکن اور حضرات غالباً یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ کلام مجید سے یوسف کا غیر معمولی جمیل ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا اور ایک جگہ بھی اُس کی طرف اشارہ نہیں ہے، معجزہ ہونا تو خیر بڑی بات ہے۔

چونکہ قصۂ یوسف آپ کے سامنے ہوگا اس لئے میں اس کو شروع سے نہیں بیان کرتا بلکہ جن مقامات کے بیان کی ضرورت ہے انھیں کی طرف اشارہ کرونگا۔

کلام مجید میں پہلے یوسف کے خواب دیکھنے کا ذکر ہے کہ انھوں نے چاند سورج اور گیارہ ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا۔ اس کے بعد بھائیوں کا اُن کو کنوئیں میں ڈالدینے کا بیان ہے اور پھر ایک قافلہ کا آکر اس کنوئیں سے نکالنے کا ذکر کیا گیا ہے یہاں تک ایک جگہ بھی یوسف کے حسن کا ذکر نہیں ہے حالانکہ وہ موقع جب اُن کے بھائیوں نے آپس میں باتیں کی ہیں کہ ہمارا باپ یوسف اور اس کے بھائی کو زیادہ چاہتا ہے ایسا تھا۔ اس چاہنے کی وجہ اُن کا جمال ظاہری قرار دیجاتی، لیکن اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اُس کے بعد جب کاروان کنوئیں پر آیا اور اُس نے ڈول ڈالکر یوسف کو نکالا تو اس وقت کہنے والے نے صرف یہی کہا کہ "یا بشریٰ ہذا غلام" اگر یوسف غیر معمولی جمیل ہوتے تو ناممکن تھا کہ وہ وقت گزر جاتا کہ لوگ کہتے کہ کیسا خوبصورت لڑکا ہے۔ بہرحال یہاں سے بھی آپ کے جمال کی نفی ہوتی ہے۔

اس کے بعد جب آپ مصر پہونچتے ہیں اور ایک مصری سردار یا عزیز مصر (عزیز مصر سے شاہ مصر مراد نہیں ہے، آپ کو مول لیکر

اپنی بیوی زلیخا کو دیتا ہے تو صرف یہ کہتا ہے کہ " اکرمی مثواہ عسیٰ ان ینفعنا او نتخذہ ولدا " یعنی اس کو اچھی طرح رکھو شاید کسی وقت ہمارے کام آئے یا ہم اسے متبنیٰ کریں" اس نے بھی ان کے حسن وجمال کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اُس کے بعد خدا یوسف کو جوانی تک پہونچانے کا ذکر کرتا ہے تو ان الفاظ میں :-

" ولما بلغ اشدہ آتیناہ حکما وعلما "

یعنی جب وہ جوان ہوا تو ہم نے اُس کو علم وحکمت سکھائی۔ اس جگہ بھی ان کے جمال کا کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ اگر اللہ ان کو علم وحکمت کے ساتھ صورت ظاہری بھی غیر معمولی عطا کرتا تو ضرور اس کا اظہار فرماتا۔

اس کے بعد زلیخا کی لگاوٹ کا بیان ہے کہ دروازہ بند کرکے یوسف کو اپنی طرف مائل کرنے لگی لیکن آپ راغب نہیں ہوئے، پھر قمیص کے پھٹنے اور یوسف کے الزام سے بری ہونے کا بیان ہے، اس میں بھی کہیں آپ کی خوبصورتی کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

پھر اس دعوت کا ذکر ہے جب زلیخا نے مصر کی بعض عورتوں کو طلب کرکے یوسف کو اُن کے سامنے پیش کیا۔ اور اُنھوں نے یوسف کو دیکھکر بجائے پھل کاٹنے کے اپنی انگلیاں کاٹ لیں اور یہی ایک واقعہ ایسا ہے جس سے جمال یوسف پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ یعنی وہ اس قدر جمیل تھے کہ عورتیں انھیں دیکھکر مبہوت ہوگئیں اور اپنے ہاتھ زخمی کرلئے اور چیخ اٹھیں کہ ! ہذا بشرا۔ ان ہذا الا ملک کریم" یعنی یہ انسان نہیں ہے کوئی بڑا شریف فرشتہ ہے۔ لیکن چونکہ لوگوں نے اس واقعہ کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے

کلام مجید کے الفاظ اس واقعہ کے متعلق یہ ہیں :-

وقال نسوۃ فی المدینۃ امرات العزیز تراود فتٰھا عن نفسہ۔ قد شغفھا حبا۔ انا لنراھا فی ضلل مبین۔ فلما سمعت بمکرھن ارسلت الیھن واعتدت لھن متکا و آتت کل واحد منھن سکینا وقالت اخرج علیھن فلما راینہ اکبرنہ و قطعن ایدیھن و قلن حاشا للہ ما ھذا بشرا۔ ان ھذا الا ملک کریم قالت فذلکن الذی لمتننی فیہ ولقد راودتہ عن نفسہ فاستعصم ولئن لم یفعل ما امرہ لیسجنن ولیکونا من الصاغرین۔ قال رب

اور کہا چند عورتوں نے شہر میں کہ عزیز کی عورت اپنے غلام سے لگاوٹ کرتی ہے اور اس کی محبت میں بیقرار ہے۔ بیشک ہم دیکھتے ہیں، اُس کو علانیہ گمراہی میں۔

جب عزیز مصر کی عورت نے اُن کی کرکی باتیں سنیں تو انھیں بلا کر ان کی دعوت کی اور ہر ایک کے ہاتھ میں چھری دیدی اس کے بعد یوسف سے کہا کہ سامنے آجاؤ۔ پھر جب دیکھا عورتوں نے یوسف کو تو اسکو بڑا جانا اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور بولیں دہائی ہے یہ انسان نہیں ہے بلکہ بزرگ فرشتہ ہے۔

زلیخا نے کہا کہ یہ وہی ہے جس کی بابت تم مجھ کو ملامت کرتی تھیں!

السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ والا تصرف عنی کیدھن اصب الیھن واکن من الجاھلین :-

بیشک میں نے اس سے لگاوٹ کی اور وہ بچا رہا، لیکن اس نے میرا کہنا نہ مانا تو وہ ضرور قید کیا جائے گا اور ذلیل ہوگا۔

یوسف نے کہا اے میرے پروردگار قید میں جانا مجھے زیادہ محبوب ہے اس چیز سے جس کی طرف وہ مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو اُن کے مکر کو دور نہ کریگا تو میں اُنکی طرف جھک جاؤنگا اور جاہلوں میں سے ہوجاؤنگا۔

حاصل اِن آیات کا یہ ہے کہ شہر کی بعض عورتوں نے (جو بعض مفسرین کے بیان کے مطابق خود عزیز مصر کے ہاں کام کرنے والی یا آنے جانے والی تھیں) زلیخا کی محبت کا چرچا کیا تو زلیخا نے ان کے مکر کو سمجھ کر دعوت دی اور یوسف کو سامنے بلایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ یہاں سب سے زیادہ اہم لفظ مکر ہے عربی میں لفظ مکر کے وہی معنے ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں یعنی فریب خدع یا عورتوں کے لحاظ سے اس جگہ تریا چرتر کہہ لیجئے۔ ظاہر ہے کہ محض کسی کی محبت کا ذکر کرنا یا محبت پر کسی کو ملامت کرنا مکر تو نہیں ہوسکتا اس لئے صاف ظاہر ہے کہ یا وہ عورتیں خود یوسف سے محبت کرتی تھیں جس کا علم زلیخا کو تھا اور اس لئے ان کے اس تجاہل کو مکر سے تعبیر کیا گیا یا پھر یہ کہ پہلے سے ان عورتوں میں اور زلیخا میں یوسف کو رام کرنے کے لئے کوئی حیلہ طے ہوگیا اور اس لئے اس کو مکر سے تعبیر کیا گیا۔ بہرحال انھیں سے جو بات بھی ہو یہ یقینی ہے کہ جب یوسف کے سامنے آئے تو انھوں نے بھی اُن کے ساتھ لگاوٹ شروع کی اور جب قابو میں نہ آئے تو ڈرانے کے لئے یا اُن کو قید خانہ بھیجنے کے لئے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ اس کا ثبوت خود اس سے بھی ملتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد یوسف نے کیا کہا۔ یوسف کے الفاظ یہ ہیں السجن احب الی مما یدعوننی الیہ یعنی قید خانہ مجھے زیادہ محبوب ہے اُس چیز سے جس کی طرف وہ بلاتی ہیں۔ اس میں لفظ یدعوننی قابل غور ہے، یعنی آپ نے صیغۂ جمع میں فرمایا۔ اگر صرف زلیخا کی لگاوٹ کا اظہار مقصود ہوتا تو صیغہ جمع کی ضرورت نہ تھی۔ دوسرا ثبوت انھیں آیات سے اور بھی ملتا ہے۔ وہ یہ کہ جب یوسف نمودار ہوئے اور ان کو دیکھ کر انھوں نے ہاتھ کاٹ لئے تو اُنھوں نے اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ سے کیا: "ان ہذا الا ملک کریم" یعنی یہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔ لفظ فرشتہ ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو یوسف کے حسن وجمال پر حیرت نہیں ہوئی، بلکہ اُن کے تقدس پر تعجب ہوا یعنی جب اُنھوں نے دیکھا کہ یوسف ان کی طرف مائل نہیں ہوئے اور ہاتھ کاٹ ڈالنے پر بھی نہ اُن کو رحم آیا نہ خوف سے اُن کی جانب راغب ہوئے تو انھوں نے کہا کہ یہ آدمی نہیں فرشتہ ہے جو کسی طرح معصیت پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔"

اس امر کی تصدیق کہ ان عورتوں نے قصداً ہاتھ کاٹ ڈالنے کا مکر کیا تھا تاکہ یوسف کسی نہ کسی طرح ان کی طرف مائل ہوجائیں یا پھر اس بہانہ سے قید خانے بھیجدئے جائیں۔ بعد کی آیتوں سے بھی ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جب یوسف قید خانے بھیجدئے گئے کچھ عرصہ

جب بادشاہ نے اُن کے علم تعبیر رویا کا حال معلوم کرکے ایک آدمی اُن کے پاس بلانے کو بھیجا تو یوسف نے اس آدمی سے کہا کہ "(ارجع الیٰ ربک فسئلہ مابال النسوۃ اللتی قطعن ایدیھن، ان ربی بکیدھن علیم" (اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ اور دریافت کرو کہ اُن عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ میرا خدا ان کے مکر سے واقف ہے)

جب بادشاہ کے پاس یوسف کا یہ پیغام پہونچا تو اُس نے ان عورتوں سے دریافت کیا کہ ماخطبکن اذ راودتن یوسف عن نفسہ قلن حاشاللہ ماعلمنا علیہ من سوء (کیا ہوا تھا جب تمنے یوسف سے لگاوٹ کی تھی، انھوں نے کہا کہ ہم نے یوسف میں کوئی بُرائی نہیں پائی یعنی یہ کہ اس میں کوئی لغزش نہیں پائی) ان آیات سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ ان عورتوں نے یوسف سے لگاوٹ کی اور قصداً اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تاکہ شاید اسی طرح وہ مائل ہوجائیں۔

پھر جب ہاتھ کاٹنے کی صورت یہ قرار پائی تو اس کی وجہ حُسن یوسفی نہیں ہوسکتی۔ الغرض کلام مجید میں صراحۃً "کنایۃً" کسی جگہ یوسف کے حسن وجمال کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ عورتوں کے ہاتھ کاٹ لینے سے یہ امر مستنبط ہوسکتا تھا" سو اس کی بھی حقیقت ظاہر کردی گئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یوسف کی خوبصورتی ہونے میں کوئی استحالۂ عقلی ہے۔ ممکن ہے وہ بہت جمیل رہے ہوں، لیکن گفتگو صرف اتنی ہے کہ کلام مجید میں کہیں اس کا ذکر ہے یا نہیں؟

نیاز

ضرورت ہے

اگر آپ کو خیمے۔ دریاں اور چرمی سامان کی ضرورت ہو تو فوراً ہمیں ایک کارڈ لکھئے ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزاں ملتا ہے۔ والی ریاست بڑے بڑے رؤسا ہمارے ہی یہاں سے مال منگاتے ہیں فہرست اردو یا انگریزی کی منگاکر ملاحظہ فرمائیے ہمارا کارخانہ صداقت کیوجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہوگیا ہے

محمد حسین اینڈ کو ٹنٹ مرچنٹ فتح گڑھ یو۔پی

ہماری شہرت گزشتہ ۲۰ سال سے قائم ہے

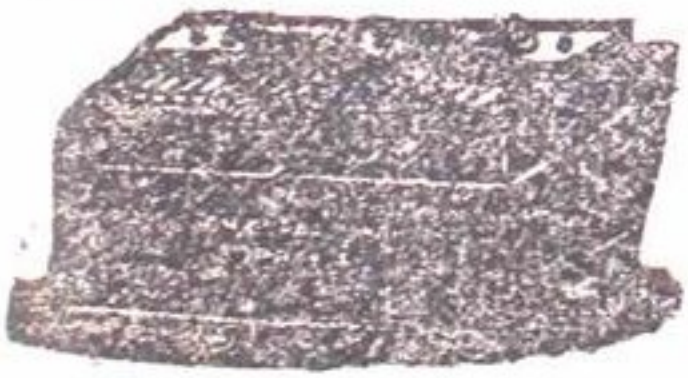

اگر آپ کو بہترین قسم کے ایسے ہارمونیم درکار ہوں جو آپ کی زندگی کا ساتھ دے سکیں تو صرف ہم سے خط وکتابت کیجئے۔

ہمارے بنائے ہوئے ہارمونیم اس قدر شیریں سُروں کے ہیں کہ کہیں اور مل ہی نہیں سکتے صرف ہمیں ایسے ہارمونیم بناتے ہیں قیمتیں مختلف ہیں۔ فہرست مفت

CHAITSINGH GURBAKSINGH & BROS.

292 N, SANDHURST ROAD,

BOMBAY.NO.4

چند روز لکھنؤ میں!

بعد مدت کے نظر آیا دیار لکھنؤ! دل فدائے لکھنؤ! آنکھیں نثارِ لکھنؤ!
عرش ساماں کیوں نہو خاکِ دیارِ لکھنؤ ہے بہارِ خلد سے بڑھکر بہارِ لکھنؤ!
مٹ چکے ہیں گرچہ تاج و تاجدارِ لکھنؤ پھر بھی زندہ ہے ابھی روح وقارِ لکھنؤ
مشرقی رنگِ تمدن کی ہے خالص یادگار کیوں نہ ہو ہر مشرقی دل سے نثارِ لکھنؤ
نو بہارِ خلد کے کھوئے ہوئے کچھ خواب میں مایۂ حیرت نہیں نقش و نگارِ لکھنؤ
یہ محل اسلاف کی تہذیب کا گہوارہ ہے ہند میں کافی ہے یہ تنہا وقارِ لکھنؤ
یہ فلک رتبہ مکاں! یہ خلد ساماں گلستاں! رشکِ مہر و ماہ ہیں نقش و نگارِ لکھنؤ
وہ ہے تنہا آسماں پر ہیں لاکھوں اختر نہاں کیوں نہو زہرہ کو رشکِ نغمہ زارِ لکھنؤ
"ماہ" در آغوش ہے ہر ذرہ اس کی خاک کا اے زہے حسنِ "طربگاہ" دیارِ لکھنؤ!
محفلِ شعر و ادب ہے مستِ صہبائے نیاز ہے "نگار" لکھنؤ! بیشک نگارِ لکھنؤ
خامۂ جالب کہ ہے جس پر صحافت کو غرور ایک مدت سے ہے مخمورِ بہارِ لکھنؤ
کس ادب سے لب پر آتا ہے مرے احسن کا نام جن کی ہستی ہے فروغِ افتخارِ لکھنؤ
حضرت شہزادۂ باقر علیخاں کا خلوص دل میں ہے مہماں بطورِ یادگارِ لکھنؤ
چونک کر خوابِ لحد سے اپنے دیرانوں کو دیکھ! جانِ عالم! آہ او جانِ بہارِ لکھنؤ!!
آہ میری پارسائی کی یہ سادہ بیکسی! ہائے یہ رنگینیٔ لیل و نہارِ لکھنؤ!
مجھکو ان روشن شبستانوں میں مرجانے بھی دے! اے طرب آبادِ ہند! اے حسن نارِ لکھنؤ!
ایک حسنِ نازنیں تڑپائیگا برسوں ہمیں یہ "خلش" دل میں رہیگی یادگارِ لکھنؤ

اگلی عظمت یاد آتی ہے یہ رونق دیکھکر
ہم تو اختر اب بھی ہیں ماتم گسارِ لکھنؤ

اختر شیرانی

عہدِ گزشتہ کی یاد

اب کہاں دورِ بادۂ گلفام — اب کہاں وہ سحر کجا وہ شام
اب کہاں حسن و عشق کی باتیں — اب کہاں زندگی کا لطفِ دوام
اب کہاں شعر و شاعری کا جنوں — اب کہاں آرزوئے حُسنِ کلام
وہ زمانہ بھی یاد ہے مجھکو — فکرِ اشعار میں تھی نیند حرام
گاہ اقبال کی نواؤں میں گم — گاہ غالب کے میکدے میں قیام
بتکدے میں کبھی سیاہ عمل — صومعہ میں کبھی مہِ اسلام
فلسفے کی فضا میں گہ پرواز — گاہ مذہب کے دشت میں ضرغام
گاہ آغوشِ حسن میں بے کل — گاہ راہ طلب میں بے آرام
اب نہ وہ دل نہ وہ زمانہ ہے — اللہ اللہ رے گردشِ ایام
فکرِ دنیا سے کس کو فرصت ہے — یاد ہے اب کسے غزل کا نام
ذوق و غالب کے شعر بھول گئے — رہ گئے یاد دفتری احکام
شعر کہئے کہ نوکری کیجے — دل کی سنئے کہ کیجے پیٹ کا کام
آج فرصت کی شکل دیکھی تھی — چند اشعار ہو گئے ارقام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا — تو سنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

"زہر غم کر چکا ہے میرا کام" — اے دلِ ناتواں چلا میں تھام
حسن پر جاں نثار کرتے ہیں — کتنا محبوب ہے یہ خوں آشام
تم کو لاتی جو چاند کے بدلے — میرے غمخانہ میں نہ آئی وہ شام
بچ کے چل شہرِ حسن سے اے دل — کہ یہاں خنجر و تفنگ ہے عام
گلستاں میں بہار آ بھی چکی — ہائے لایا نہ کوئی تیرا پیام
اُن کے غم میں وہ لطفِ مے نہ رہا — اب کہیں اس کو کس بنا پہ حرام
تیری شمشیر نے گلے مل کر — کس ادا سے کیا ہے کام تمام

آہ عاشق کبھی نظیر بھی تھا
سنتے ہیں اب بھی ہے مگر ناکام

نظیر لودھیانوی

غزلیات

آزاد انصاری

کیا خاک مان لوں کہ وہ نامہرباں تھا — اک طرز التفات سے کیا کچھ عیاں نہ تھا
یوں یاد آؤ گے ہمیں اصلا خبر نہ تھی — یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم و گماں نہ تھا
اُمید کے لحاظ سے میرا گماں غلط — برتاؤ کے خیال سے تو مہرباں نہ تھا
تم آئے اور بزم کا نقشہ بدل گیا — دم بھر میں وہ طرازِ طرب و سماں نہ تھا

مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی

بالیں پہ نہ لائے کوئی اُسے کیا فائدہ شرما جائیگا — اب حال زبوں و زار مرا اُس سے بھی دیکھا جائیگا
وہ صید ضعیف و لاغر ہوں سب دیکھ کے مجھکو کہتے ہیں — اس بیچارے سے زخمی ہو کر کیونکر تڑپا جائیگا
میں اُس سے کہوں دکھ درد ترا بس میری تو ایدل تو بہ ہے — سب آئی گئی مجھپر ہوگی کمبخت ترا کیا جائیگا
آہ سوزاں رد کی تو رد کی آنسو پینا قہر ہوا — اب چھالے پہ چھالا چھالے سے چھالا پڑ جلتا جائیگا
فریاد کا شنوا کوئی نہیں بیکس کا سہارا کوئی نہیں — کچھ دیکھ لیا اس دنیا میں کچھ حشر میں دیکھا جائیگا
کیا عرض تمنا کا حاصل وہ ایک ہی پر فن ہے اے دل — یا باتیں بنائی جائیں گی یا باتوں میں ٹالا جائیگا
دیدار کی حسرت جو ہے سو ہے دل کی تپش کو کیا کیجے — بھونسی سی چھا جائیگی جب پردہ اٹھایا جائیگا
الزام ندو ناراض نہ ہو اس دل سے بہت مجبور ہوئے — اب تم جو سہارا دو اٹھیں یوں ہم سے نہ اُٹھا جائیگا
جب یاد دلایا روز جزا کافر نے کہا اور ہنسکے کہا — سی جائیں گے تیرے ہونٹ اثر جب نام وفا آجائیگا

اثر رامپوری

پہلی سی درد عشق میں لذت نہیں رہی — یعنی جو زندگی کی تھی صورت نہیں رہی
عہد جفا میں تیرے ہوئے لوگ ہوشیار — دنیا فریب خوردۂ الفت نہیں رہی
خوگر جفائے عشق کا جب دل مرا ہوا — ایذا پسند ان کی طبیعت نہیں رہی
مجکو جواب طاقت رفتار دے گئی — جب دو قدم بھی منزل الفت نہیں رہی

سچ تو یہ ہے کہ میری وفا کے جواب میں — اُن کی جفا کی کوئی حقیقت نہیں رہی
دیکھا جو ہم نے عالمِ تمکینِ حسنِ یار — عرضِ نیازِ عشق کی جرأت نہیں رہی
وہ لطف درد عشق میں پایا ہے اے اثرؔ — اظہارِ دردِ عشق کی حاجت نہیں رہی

اکبر حیدری

سراپا سوز بنکر زندگی گا ساز پیدا کر — شکستِ رنگِ رُخ سے بھی کوئی آواز پیدا کر
ابھی تک منتظر ہے عالمِ نشو و نما تیرا — بھلا دے کاہشِ انجام کو آغاز پیدا کر
جسے حدِ نظر تک کامرانی کی تمنا ہو — فضائے عالمِ امکاں میں وہ پرواز پیدا کر
بھلا دے اپنی پستی کو مگر شوقِ بلندی میں — مٹا دے اپنی ہستی کو مگر اعزاز پیدا کر
ہوا کی جنبشوں پر قدرتِ رفتار ہو جس کو — شکستِ آہ سے ایسی کوئی آواز پیدا کر

امین سلونوی

شوقِ ایذا طلبی کا بھی نہ ارماں نکلا — درد بھی دل میں بہ اندازۂ حرماں نکلا
آہ ہستیِ دلِ مرحوم کی پھر یاد آئی — آج اک قطرۂ خوں پھر سرِ مژگاں نکلا
منتشر کر دیا سب رازِ خزاں نے آ کر — پتہ پتہ مرے گلشن کا پریشاں نکلا
ہائے وہ دل جسے سمجھا تھا میں سرمایۂ ہستی — اس کا سرمایہ فقط نالۂ سوزاں نکلا
خوفِ انجامِ محبت کو بھلایا غم نے — جس کو دشوار سمجھتے تھے وہ آساں نکلا
موت نے توڑ کے چھوڑا مری وحشت کا طلسم — پھر نہ صحرا نظر آیا نہ وہ زنداں نکلا
بھڑکا سو بار چراغِ سرِ تربت میرا — جب جہاں میں کسی ناشاد کا ارماں نکلا

ثاقب جالندھری

خیالِ دوست میں اس درجہ کھو گیا ہوں میں — کہ ناشناسِ تمنائے ماسوا ہوں میں
نظر ہی جانتی ہے حاصلِ نظارۂ دوست — زباں سے کہہ نہیں سکتا جو دیکھتا ہوں میں
مجھے وہ کب ہے گوارا جو ہے پسند انھیں — انھیں پسند وہ کب ہے جو چاہتا ہوں میں
کچھ اور حوصلۂ جور ہیں زمانے کو — اگرچہ دستِ زمانہ سے مٹ گیا ہوں میں
شبِ فراق میں اللہ رے اضطراب مرا — پکڑ کے دامنِ محشر کو کھینچتا ہوں میں

مزا تو جب ہے وہ آمادۂ مداوا ہوں — اِدھر پکار اٹھے درد لا دوا ہوں میں
یہی اُمید تو ہے باعثِ قیامِ حیات — تمھارے وعدۂ فردا پہ جی رہا ہوں میں
بذاتِ خود نہیں شمس و قمر۔ مگر ثاقب — سپہرِ عالمِ اسباب کی ضیا ہوں میں

رازؔ رامپوری

تسلی سے نہیں خوفِ حوادث دل سے نکلے گا — خدا کا کام تجھ سے ناخدا مشکل سے نکلے گا
جہانِ عشق کے آئین کی تشریح ہوتی ہے — وہ فقرا تم بھی سننا جو لبِ بسمل سے نکلے گا
شبِ غربت مری کب تک الٰہی طول کھینچے گی — دھواں کب تک چراغِ سرحدِ منزل سے نکلے گا
جوابِ شوق بن اے بے نیازی مطمئن ہو نہیں — دکھا دونگا نکلنے والا جب محفل سے نکلے گا
ہر اک ذرہ میں رنگ آجائیگا تصویرِ لیلیٰ کا — اگر مجنوں حدودِ ناقۂ و محمل سے نکلے گا
اٹھا کر در سے پھر آنے کی بابت پوچھتے کیا ہو — نہ سمجھو گے وہ فقرا جو لبِ سائل سے نکلے گا
ارادہ تھا کہ میں اعلانِ تسکین نظر کر دوں — مگر اے رازؔ ان کا راز کیونکر دل سے نکلے گا

شوقؔ مرادابادی

دیر و حرم سے شوق نکالے ہوئے تو ہیں — اس پر بھی اپنے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں
کیا رنگ لائے دیکھئے سینہ کی یہ فضا — زخمِ کہن فراق میں آئے ہوئے تو ہیں
بس اب تمھارے ہاتھ ہے شرمِ گناہِ عشق — رسوا تمھاری چاہنے والے ہوئے تو ہیں
کر تو رہے ہیں ضبطِ تصور کسیکا ہم — بے اختیاریوں کو سنبھالے ہوئے تو ہیں
اے جوشِ عشق شوق کو منزل نصیب ہو — راہِ طلب میں جان کے لالے ہوئے تو ہیں

فرخؔ بنارسی

کیوں نہ ہو ایسی بندگی پر ناز — جسمیں حاصل ہو لطف راز و نیاز
میری ہستی ہے ایک نغمۂ راز — پردۂ ساز کُن کی ہوں آواز
جستجو میں رہی تری مدہوش — ہم حقیقت سمجھ سکے نہ مجاز
فکرِ ہستی سے بے نیاز کیا — اے غمِ عشق تیری عمر دراز
ہمہ تن گوشِ بزمِ فطرت ہے — کس نے چھیڑا ہے ساز بے آواز

میری ہستی عجیب ہستی ہے — خود ہے جویائے راز خود ہی راز
موت ہے زندگی کا دور جدید — میرا انجام ہے مرا آغاز
عکس آئینہ تجلی ہوں — ہائے رے اتصال ناز و نیاز
حد منزل وہی ہے اے فرخ — ختم ہو جائے جس جگہ پرواز

زنان بازاری

کی پُراسرار زندگی کے متعلق چھ عجیب و غریب ناول

سعید - ایک تعلیم یافتہ نوجوان اور ایک پاتر کے جذبات کا بیمثل خاکہ انجام اخلاقی فلاح پر کیا گیا ہے قیمت عہ

شاہد رعنا - دہلی کی ایک ڈیرہ دار طوائف کی خود نوشت سوانح عمری ہے کمسنی سے لیکر بڑھاپے تک کے حالات مکر و فریب کی داستانیں آپ بیتی کی صورت میں عجیب لطف پیدا کرتی ہیں قیمت ۸ر

انجام عیش - بدکاری اور آوارگی کے مختلف پہلو قصہ کی صورت میں اسقدر تکمیل کے ساتھ دکھائے گئے ہیں کہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آسکتے - سوسائٹی کی اصلاح کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے قیمت ۱۱ر

سعادت - دہلی کی ایک تعلیم یافتہ سلیقہ مند خوبصورت طوائف کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عاشقانہ خط و کتابت اور وصل و فراق کے کیفیات کو عجیب انداز سے بیان کیا ہے قیمت ۸ر

سزائے عیش - فلسفۂ حسن و عشق اور تفریحات عامہ پر عجیب و غریب کتاب ہے - اس میں ایک شریف گھر اور ایک طوائف کے دنرات کا ٹائم ٹیبل کا فرق دکھایا گیا ہے قیمت ۱۰ر

سیراب عیش - طوائف سے نکاح کر کے اُن کو بہو بیٹیوں میں لاکر رکھنے کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے - قیمت ۱۰ر

قاری سرفراز حسین صاحب کی دیگر تصانیف

احیاء ملت - اس میں قاری صاحب نے مسلمانوں کی اصلاح معاملات اور عام بہبودی کے متعلق مجتہدانہ اور مخلصانہ خیالات ظاہر کئے ہیں جو اسوقت تک کسی نے ظاہر نہیں کئے - قیمت صرف ۸ر **لطف زندگی** - قاری صاحب کی سحر نگار قلم کا ایک مختصر مگر دلچسپ قصہ ہے قیمت ۳ر

انیس الغربا - قاری صاحب کی ایک کارآمد تصنیف ہے - اسمیں غریب مسلمانوں کی بہتری اور بہبودی پر قلم فرسائی کیگئی اور مفلسی دور کرنیکی ہدایت دی ہے قیمت ۸ر

منیجر "نگار" لکھنؤ سے طلب کیجئے

بھاگلپوری ٹسری ریشمی صافے

ٹسری اور ریشمی صافے یا تھان برائے کوٹ، قمیص، شیروانی اعلیٰ درجے کے درکار ہیں تو ہمارے یہاں سے منگا کر استعمال میں لائیے -

مولوی کبیر احمد خاں برادرز بھاگلپور سٹی

بسبب بے ادبی اصل عبارت نہیں لکھی گئی صرف

نمونہ دیا گیا ہے ہر سطر میں خوشنما رنگ ہوگا جو نگاہ کے واسطے مفید ہے

اکتالیس خوبیوں والا پچیس مہری معجز نما

ہدیہ عالی

ہمی شان کا قرآن مجید

جبکی

ہر مسلمان کو ضرورت ہے

مقدس میں ایسی خوبیاں جن کا مطالعہ مبلغین اسلام اور سچائی کے متلاشیوں کے لئے بیحد ضروری ہے۔ نہایت خوشخط صاف اور روشن چھپائی نفیس کاغذ لقطع متوسط صحیح اور مستند حکیم الامتہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ العالی کا سلیس عام فہم ترجمہ اور حاشیہ پر تفسیر موضح القرآن کا خلاصہ (۱) ہر پارے کے شروع میں کتنی مقدس مقام کا لکھنا اور تاریخی حالات (۲) مضامین قرآن کی مکمل فہرست جو آیت چاہو نکال لو (۳) ہر سورۃ کی شان نزول (۴) مولانا اشرف علی تھانوی کا سلیس اردو ترجمہ (۵) حاشیہ پر تفسیر موضح القرآن کا خلاصہ (۶) ہر سورۃ کے متعلق وہ تعویذ و عمل جو اولیا اللہ کے معمولات ہیں (۷) تعبیر نامہ خواب (۸) فضائل قرآن پاک (۹) ہر سورۃ کے خواص اور طریقہ عمل (۱۰) قرآنی مسائل (۱۱) ربط آیات (۱۲) قرآنی سورتوں کا باہمی ربط (۱۳) تلاوت کا طریقہ جس سے پڑھنے میں غلطی نہیں ہوتی (۱۴) کل پیغمبری دعاؤں کو ایک جگہ درج کیا ہے (۱۵) پچیس انبیاء علیہ السلام کے حالات جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے (۱۶) مشہور فرشتوں کے حالات (۱۷) ان کافروں کے حالات جن کا ذکر قرآن پاک میں ہے (۱۸) ان قبیلوں کے حالات جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے (۱۹) دنیاوی مقامات مقدسہ کا ذکر (۲۰) اخروی مقامات کا حال (۲۱) ان شاروں کا حال جن کا ذکر قرآن پاک میں ہے (۲۲) ان پرندوں کے حالات جن کا ذکر قرآن پاک میں ہے (۲۳) ان جنوں کا حال جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے (۲۴) معوذتان (۲۵) درود شریف جو انبیاء اللہ سے منقول ہیں (۲۶) قرآن مجید پر زبر زبر اور تشدید وغیرہ کی صحیح تعداد (۲۷) وہ مقامات جہاں اعراب کی تبدیلی سے کفر لازم آتا ہے (۲۸) بسم اللہ شریف ہر جگہ کی وضع سے لکھی گئی ہے (۲۹) منشی عبدالغنی صاحب خوشنویس کا لکھا ہوا ہے جو اپنا جواب نہیں رکھتے (۳۰) دہلی کے تمام فضل علماء سے اسکی صحت کی ہے (۳۱) پیغمبروں کے القاب (۳۲) قرآن مجید کے پڑھنے اور سننے کا ثواب (۳۳) قرآن مجید کے ظاہری اور باطنی آداب (۳۴) آنحضرت صلعم کی مبارک سوانحعمری (۳۵) قرآن شریف کے عملیات (۳۶) قرآن شریف کے منزل من اللہ ہونیکا ثبوت (۳۷) قرآن شریف کے پڑھنے کے احکام (۳۸) قرآن پاک سمجھکر پڑھنے کی فضیلت (۳۹) قرآن شریف کے نقش کی خوبی اور اسکی ترکیب (۴۰) نقشہ مخارج حروف (۴۱) نماز میں قرآن شریف پڑھنے کے فضائل (۴۲) قرآن شریف کتنے دنوں میں پڑھنا چاہیئے (۴۳) اس امر کا ثبوت کلام مجید رسول عربی صلعم پر کیوں نازل ہوا (۴۴) ملک عرب کے ضروری اور تاریخی حالات کا بیان جسکا کلام مجید کے نزول سے تعلق ہے (۴۵) کلام مجید کے تمام الہامی کتابوں کے جامع اور محافظ ہونیکا ثبوت (۴۶) علوم قرآن مجید کی آیات سے ثابت کئے گئے ہیں (۴۷) یہ قرآن مجید تبلیغ کے لئے بس ہے نوٹ بارجوان مذکورہ بالا خوبیوں کے جن کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ آجتک کسی کلام اللہ کے ساتھ یہ خوبیاں شامل نہیں جو ضرورت زمانہ کے لحاظ سے بے انتہا ضروری ہیں ہدیہ مجلد چرمی چار روپے محصول ڈاک وغیرہ ۴ عہ

۲۳ خوبیوں والا شاندار بچسورہ مترجم

سورہ یٰسین، سورہ رحمٰن، سورہ نوح، سورہ واقعہ، سورہ ملک، سورہ نبا، سورہ کہف سورہ تغابن موخواص اور پڑھنے کی ترکیبیں جو ہر مراد کے لئے کارآمد ثابت ہوئی ہیں (۶) ہفت سکیل (۷) شش قفل (۸) دعائے امن (۹) دعائے تمکین (۱۰) دعائے درد سر (۱۱) دعائے تپ دق (۱۲) اور سال بھر کی بہت سی دعائیں عہ پڑھنے کی ترکیب کے درج ہیں (۱۳) اس کے بعد دعائے گنج العرش (۱۴) نود و نہ نام باری تعالیٰ (۱۵) نود و نہ نام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (۱۶) دعائے قبرستان (۱۷) دعائے رفع ہمات (۱۸) دعائے دافع طاعون (۱۹) دعائے ہر مراد دنیا (۲۰) اور دظائف کے ساتھ خواص (۲۱) طریقہ ذکر قلبی (۲۲) ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کا تحت اللفظ ہے اور اس ترجمہ سے ہر شخص عربی سمجھ سکتا ہے اور قلم بھی خوب جلی ہے جس سے دیدہ حضرات آسانی سے تلاوت کر سکتے ہیں ہدیہ عاجزی ۸ محصول ۶ ہدیہ ۳ جلد عہ محصول ۱۰ جلد صرف محصول ڈاک۔ ملنے کا پتہ:-

بہشتی زیور مکمل ۱۲ حصہ عہ قصص الانبیاء عہ

حامد حسین خوشنویس کوچہ چیلان بمقابلہ گرلز اسکول دہلی

صدائے صور مسلمانوں کو ایک دم بیدار کرنے والی کتاب ایک روپیہ

علاوہ محصول ... صفحہ ... ہدیہ

زیادہ تعداد میں منگانے والے حضرات قریب کے ریلوے اسٹیشن کا پتہ لکھیں اور روپیہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کریں

ہدیہ مجلد چرمی ۴ روپیہ محصول ۱۲ عہ

دو جلد صفحہ محصول ۱۴ عہ

سہ جلد صفحہ محصول ۱۶ عہ

دارالاشاعت پنجاب لاہور

لڑکوں کے لئے کتابیں

وہ تصانیف جو اخبار پھول کے سلسلے میں چھپ کر بے انتہا مقبول ہوئی ہیں۔ اور جو لڑکوں کو مطالعہ کا شوقین بنا دیتی ہیں۔

ہندوستان ہمارا

از ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ ہندوستان کی تاریخ جس طریق سے درسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس سے نہ وہ بچوں کو دلچسپ معلوم ہوتی ہے اور نہ وہ اُس سے کسی قسم کا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اردو کے نامور شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے بچوں کے لئے دلفریب اور سبق آموز بنا لے کو پہلی مرتبہ تاریخ ہند کی مشہور کہانیاں آسان اور بہت موثر انداز میں نظم میں لکھی ہیں۔ اس کتاب میں رامائن۔ مہابھارت۔ سری کرشن مہاراج۔ گوتم بدھ۔ سکندر۔ پٹھان اور مغل بادشاہوں۔ سکھوں اور انگریزوں کے حالات پر بیحد روانی اور قادر الکلامی سے نظمیں لکھی گئی ہیں۔ جن سے ہندوستان کی تاریخ کے تمام اہم واقعات آنکھوں کے سامنے گزر جاتے ہیں۔ اور اُن تمام قوموں کی عظمت اور شوکت کا نقشہ نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ جو مختلف زمانوں میں ہندوستان پر حکومت کر چکی ہیں۔ مصنف نے ایسی تمام باتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جن کا کسی جماعت یا فرقے کو ناگوار گزرنے کا ڈر تھا۔ اور ہر مضمون پر خود متاثر ہو کر نظم لکھی ہے + کتاب میں ستر کے قریب نظمیں ہیں۔ اور شروع میں علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب آئی۔ سی۔ ایس۔ پرنسپل اسلامیہ کالج کا دیباچہ ہے۔ کتابت۔ کاغذ۔ طباعت نہایت اعلیٰ چودہ رنگین بلاک کی تصویریں۔ نہایت خوبصورت جلد اور سرورق تحفے کے طور پر دینے کے قابل کتاب۔ قیمت عہ

عمر عیار۔ داستان امیر حمزہ میں سے عمر عیار کے دلچسپ اور پُر مذاق کارناموں کا لڑکوں کے لئے انتخاب۔ حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

زُلفی۔ ایک لڑکے کی داستان جو بھیڑیوں میں پلا تھا۔ حیرت انگیز انداز بیان۔ قیمت حصۂ اوّل ۶ر حصۂ دوم ۹ر

بن باسی سسٹم۔ رڈیرڈ کپلنگ کی مشہور کہانی رکی ٹکی ٹیوی۔ ہندوستانی لڑکوں کے لئے قیمت ۶ر

گل گدی۔ بیحد دلچسپ اور ہنسانے والی کہانیاں اور نئے اور نہایت عمدہ لطیفے۔ روتوں کو ہنسانے والی کتاب حصہ اول ۸ر حصہ دوم ۱۰ر

پرستان۔ پریوں کی بے انتہا دلچسپ اور پُر لطف کہانیوں کا دلفریب مجموعہ۔ حصہ اول ۷۰ر حصہ دوم ۵۰ر

پھولوں کی کلیاں۔ لڑکوں کے لئے سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے کی بہترین کہانیوں کا مجموعہ۔ حصہ اول ۷ر حصہ دوم ۹ر

الف لیلہ کی کہانیاں۔ لڑکوں کے لئے پھر لکھی گئی ہیں + علی بابا چالیس چور قیمت ۳ر۔ تین بہنوں کی کہانی قیمت ۵ر۔ ابوالحسن قیمت ۶ر

سندباد جہازی۔ قیمت ۱۰ر + ماہی گیر کی کہانی قیمت ۵۰ر + سوداگر کی کہانی۔ قیمت ۵۰ر + بدر بادشاہ اور جواہر شہزادی۔ قیمت ۱۰ر

بچوں کتابوں کا سٹ۔ گیارہ سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے۔ اور کم قیمت کی مفصل حال فہرست میں دیکھئے چند یہ ہیں:۔

شہزادہ عزیز ۵ر پادری کا دلچسپ قصہ ۲ر شہری پری ۲ر صابر شہزادی ۲ر بھول بھلیاں ۵ر جورو مار راجہ ۲ر دو بھائی ۶ر

تمام کتابیں ملنے کا پتہ

دارالاشاعت پنجاب ۱۹۵۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

کامنی عہ
سوانح عمر دعیار عہ

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذی ۸ر
حاجی بغلول ۸ر
پیاری دنیا ۸ر
کایا پلٹ ۸ر
میٹھی چھری ۶ر
طرحدار لونڈی عہ
طلسمی فانوس عہ ۱۲ر

جوالا پرشاد برق

مرزا کنی ۱۲ر
مار آستین ۱۲ر
بنگالی دلہن ۱۲ر
معشوقہ فرنگ ۱۲ر
پرتاب ۱۲ر
روہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی عہ
سکینہ بنت حسین ۶ر
ملکہ زنوبیہ ۳ر
قرۃ العین ۳ر
مخدرات عہ
جویائے حق للعہ
نعمت چین عہ
فاتح مفتوح عہ
بابک خرمی عہ

الفانسو ۱۰۲ر
ایام عرب عہ
قیس ولیلیٰ عہ
یوسف وزلیخہ عہ
زوال بغداد عہ
مینا بازار عہ
مقدس نازنین عہ
رومۃ الکبریٰ عہ
فلپانا عہ
شوقین ملکہ عہ
منصور موہنا ۸ر
حسن انجلینا ۸ر
ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
فردوس برین ۸ر
حسن کا ڈاکو عہ
دربار حرام پور ۱۰ر
غیب دان دلہن عہ
بدرالنسا کی مصیبت ۳ر
خوفناک محبت عہ
میوۂ تلخ ۸ر
نیکی کا پھل عہ

حکیم محمد علی مرحوم ہردوئی

تیل کا سانپ عہ
رام پیاری عہ
عبرت عہ
حسن سرور للعہ
اختر حسینہ عہ
دیول دیوی عہ
جعفر عباسہ عہ ۱۲ر

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق عہ
قاسم وزہرہ عہ
نیرنگ جمال ۴ر

خواجہ عبدالرزاق عشرت

زندانی ۶ر
اصلاح زبان ۶ر
قواعد میر ۶ر
اول اردو ۶ر
جان اردو ۶ر
شاعری کی پہلی کتاب ۸ر
" دوسری کتاب ۸ر
" تیسری ۸ر
" چوتھی ۸ر

میر ولی اللہ بی۔ اے

بندگی عہ
کاس الکرام عہ
لسان الغیب جلد اول عہ
" دوم عہ
" سوم عہ
" چہارم عہ
نمکدان فصاحت عہ
بادۂ ناب عہ

ظفر عمر۔ بی۔ اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری عہ ۴ر

بہرام کی گرفتاری عہ

مولوی عبدالماجد بی۔ اے

فلسفہ جذبات عہ
مکالمات برکلے عہ
پیام امن عہ ۴ر
تصوف اسلام عہ
زود پشیمان ۸ر
فلسفیانہ مضامین عہ

مولوی سید سلیمان ندوی

ارض القرآن للعہ
سیرۃ عائشہ عہ
حیات امام مالک عہ
خلافت عثمانیہ عہ
خلافت اور ہندوستان ۸ر

مولوی عبدالسلام ندوی

اسوۂ صحابہ دو جلد عہ
سیرۃ عمر بن العزیز عہ
انقلاب الامم عہ
تاریخ الحرمین عہ
فقرائے اسلام عہ
فطرت نسوانی عہ
شعر الہند دو جلد عہ

مولوی سعید انصاری

سیر الصحابہ جلد اول عہ
" دوم عہ
سیر الصحابیات عہ ۴ر

مولوی عبدالباری ندوی

مبادی علم انسانی عہ
برکلے کا فلسفہ عہ

مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی

اسوۂ حسنہ عہ
کتاب الوسیلہ عہ
ٹرکی دیورپ ۶ر

مولوی نیاز فتحپوری

گیتان جلی عہ
گہوارۂ تمدن عہ
نگارستان عہ
صحابیات عہ
تاریخ الدولتین عہ

سید سجاد حیدر بی۔ اے

زہرا ۱۳ر
جلال الدین خوارزم شاہ عہ ۱۲ر
خیالستان عہ
ثالث بخیر ۸ر
حکایات و احساسات عہ ۴ر

مولوی راشد الخیری

صبح زندگی عہ
شام زندگی عہ
شب زندگی عہ
نوحۂ زندگی ۱۲ر
منازل السائرہ عہ

بنت الوقت ۸ر
قطرات اشک عہ
عروس کربلا عہ
یاسمین شام عہ
تیغ کمال عہ
ماہ عجم عہ
محبوبۂ خداوند عہ ۴ر
موؤدہ ۸ر

مولانا حالی مرحوم

مقدمہ شعر و شاعری عہ
دیوان حالی عہ

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

سراب فلبٹن ۸ر
بالشوک شہزادی ۸ر
شہید وفا ۸ر
ممتاز بیگم ۸ر
شعلۂ رنگین ۸ر
محاصرۂ پیرس عہ
شیخ چلی عہ
بہادر ترک ۸ر
بہرام کی واپسی ۴ر
انقلاب فرانس عہ
حسن بنارس ۸ر
فطرتی جاسوس عہ
ٹرکی حرم سرا ۸ر
جنگ طرابلس ۸ر
بہرام چور عہ
زرپرست عہ ۴ر

کنجی کاراز عہ
عبدالرحمن نامہ ع
عروس مصر ع
سیلاب خون عہ
کرشمہ ع
وفادار دلہن عہ
طواف زمین عہ
سیاحت زمین عہ
سیاحت ہوا عہ
نازنین مراکش ۸ر
سمندر کی سیر ع
اسرار بالشویزم عہ
روح نیلی ے
امین بک عہ
حجاج بن یوسف عہ
یوسف پاشا عہ
انقلاب عثمانی عہ
نیلی چھتری عہ
بہرام کی آزادی ۱۲ر
بہرام کی گرفتاری عہ
بہرام کی سرگزشت عہ
پراسرار قتل ع

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب ے
بزم خیال عہ
مشاطۂ سخن عہ
انشار نسوان ۶ر
مکاتیب محسن الملک عہ
لیلی مجنون ڈراما ۸ر

مثنوی قاسم وزہرہ ۱۲ر
فسانۂ جوش عہ

تاریخی کتابیں

تاریخ اندور ۱۲ر
تاریخ عرب عہ
اسرار رنگون عہ
شباب لکھنؤ عہ
مرقع اودھ ۸ر
ارض مہرین ۸ر
تفریح الاذکیا ۸ر
تاریخ حبیب الہ ۸ر
مراۃ الکونین ع
البدر عہ
قصص الانبیا ع
صمصام الاسلام ع
فتوح الشام ع
تذکرۃ الکرام ع
منہاج النبوۃ عہ
حیات العلماء عہ
مذاہب الاسلام للہ
روضۃ الصفا عہ
تاریخ اودھ عہ
خواتین رنگون عہ
سیر السیاحین للہ
اعمالنامہ روس للہ
تاریخ مصر ے

سلاطین اودھ ے
صحیفۂ زرین ے
تاریخ دربار ے
تاریخ ایران ۱۲ر

اخلاق و عقائد

سیر الطیبات عہ
علم الاخلاق عہ
خدا کی ہستی عہ
نابینا علماء ۸ر
مختارات صوفیہ عہ
حیات ابدی عہ
افراد کا سیہ ۸ر
عوارف المعارف عہ
بوستان معرفت ۵ جلد مو
شجرۂ معرفت ۱۰ر

مراثی

مراثی دبیر ع
مراثی انیس للہ
مراثی ضمیر عہ
مراثی مونس ے ۱۲ر
مراثی دلگیر ے ۱۲ر

تذکرۃ الشعرا

تذکرۂ حسینی ۱۱ر
گلشن بیخار ۱۰ر

سراپائے سخن عہ
سوانح نظیر اکبرآبادی عہ ۱۰ر

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز عہ
کلیات عراقی ۱۲ر
دیوان حافظ عہ ۶ر
دیوان نعمت خان عالی عہ
حیات الوزری ع ۴ر
دیوان بیدل ۱۰ر
کلیات سعدی عہ
دیوان عرفی ۱۲ر
کلیات جامی عہ ۶ر
کلیات غالب عہ ۵ر
کلیات صائب عہ ۱۲ر
کلیات حزین ع ۱۲ر
دیوان عنصری ۱۴ر
دیوان ظہیر فاریابی ۶ر
دیوان غنی کشمیری ۶ر
دیوان ناصر علی ۵ر
دیوان ہلالی ۶ر
کلیات جلال سبزواری عہ

دواوین اردو

دیوان مصحفی دہلوی ۶ر
کلیات ظفر ع ۱۲ر
کلیات مومن عہ

دیوان ناسخ عہ
کلیات میر عہ
کلیات سودا عہ
کلیات انشا عہ
کلیات نظیر اکبرآبادی عہ
گلزار داغ عہ
دیوان رند ۹ر
دیوان ذوق ۱۲ر
کلیات اسمٰعیل ع
مراۃ الغیب عہ
صنمخانۂ عشق ع
فریاد داغ ۴ر
دیوان قاتل ۸ر
دیوان شہیدی ۴ر

فن شعر و عروض

زر کامل العیار ۱۲ر
ترجمہ حقائق البلاغت ۸ر
عروض سیفی ۴ر
شجرۃ العروض ۱۳ر

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات تصویر رنگین عہ
دیبا تصویر سادہ للہ
مجمع الفنون ے ۸ر
طلسم فرنگ ع
کارخانۂ عالم عہ

زنانہ کتب خانہ

شوکت آرا بیگم ے
درس حمایت ے
خاتون جنت ع ۱۰ر
بیوی کی تربیت عہ
بہشتی زیور اچھے ع ۸ر
بہشتی گوہر ۱۰ر
اقبال دلہن عہ
حسن معاشرت عہ
جواہر ریزے ۴ر
عورتوں کی انشار عہ
بیوی کی تعلیم ۴ر
تربیت اطفال عہ
اصلاح معیشت عہ
شمع ہدایت ۴ر
اصلاح الرسوم ۸ر
جہان آرا بیگم ۸ر
بچوں کی پرورش ع
آرسی مصحف ۱۰ر
سداسہاگ ۴ر
ترغیب و زگار عہ

زنانہ ناولوں کے ترجمے

الدین دلیلی عہ
فریب حسن ع
سوز عشق عہ
روز الیمبرٹ للہ
ناول اسرار ع
شام جوانی ے ۴ر
طلسمی فانوس عہ ۱۲ر

نگار بک ایجنسی نظر آباد لکھنؤ

(مطبوعۂ نگار مشین پریس نظر آباد لکھنؤ)